ابتدا تیرے نام سے

قارئین کرام! سال کا آخری مہینہ پھر پلک جھپکتے آ گیا ہے۔ان گریز پا ساعتوں کو کون روکے.....وقت سے کون کہے! ازلسے رواں دواراہِ بد کا یہ مسافر.....اپنے جلو میں کتنے ہنگامے، کتنی فتنہ سامانیاں لئے ،کہیں خوشیوں اور کہیں غموں کی سوغات بانٹتا بے نیازانہ مائل بہ سفر ہے۔اُس وقت تک ..... جو خود اُس کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے۔ جب تقویم بدل جائے گی اور حقیقت نئے پہناوے اوڑھ لے گی۔

محرم الحرام تاریخِ انبیا میں کئی فضیلتوں کا حامل مہینہ ہے۔عاشورہ کا دن امام حسینؓ کی بے مثال حق گوئی کی یاد دلاتا ہے۔جب اختیارات اور وسائل نااہل افراد کے ہاتھ میں دیکھ کر آپ سربکف نکل کھڑے ہوئے تھے۔کربلا کا ایک واقعہ اس گواہی کے لئے کافی ہے کہ اس امت کے اکابرین نے اصولوں پر کسی چیز کو مقدم نہ رکھا۔آج وہی امت ہے کہ یزیدوں کے نرغے میں ہے اور حسینیت معدوم ہو چکی۔ بے اصولی و بد دیانتی راج کر رہی ہے اور حق گوئی و بے باکی ترغیب وتحریص کے پھندوں میں گرفتار۔ضمیروں کا سودا مرغوب ترین کاروبار اور جھوٹ ومنافقت سکہ رائج الوقت۔سروں کی فصلیں کٹتی ہیں اور کھیتی کوئی اور اُچک کر لے جاتا ہے۔کربلائیں سی کربلائیں ہیں کہ برپا ہوتی ہیں، دجلہ وفرات تو کبھی کے پیچھے رہ گئے، ہر موڑ جلے ہوئے خیموں اور اکھڑی ہوئی طنابوں سے بٹا پڑا ہے۔مگر یزیدیت کے سائے ہیں کہ پلٹ پلٹ کر اُمڈے آتے ہیں۔جنوبی ایشیا سے مشرقِ وسطیٰ تک اور خلیج سے افریقہ تک امت کا یہی منظر نامہ ہے۔

جہاں تلک بھی صحرا دکھائی دیتا ہے — مری طرح سے اکیلا دکھائی دیتا ہے
یہ ایک ابر کا ٹکڑا کہاں کہاں برسے — تمام دشت ہی پیاسا دکھائی دیتا ہے

پاک فوج کی سرحدی چوکی پر نیٹو کے بلا اشتعال حملے اور چوبیس فوجیوں کی شہادت نے ہمیں ایک بار پھر ہماری ''اوقات'' کا بھرپور احساس دلایا ہے کہ کہیں ہمان کے اتحادی اور ساتھی کہنے پر خود کو واقعی ان کے دوست نہ سمجھ بیٹھیں! بقول غالبؔ

ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

امریکہ کے اس نئے ظلم اور جارحیت نے ریمنڈ ڈیوس والے واقعے کے زخموں کو ہرا کر دیا ہے۔ان معنوں میں بھی کہ اب بھی ویسے ہی خدشات ہیں یعنی اب بھی امریکہ کے ساتھ اس غیر مشروط ''تعاون'' کے بارے میں کوئی سخت فیصلہ نہیں لیا جائے گا اور چند

دن احتجاج کر کے اسے بھی قصۂ پارینہ بنا دیا جائے گا۔ شمسی ائیر بیس خالی کرنے اور نیٹو سپلائی کا راستہ بند کرنے کیدھمکیاں گیدڑ بھبھکیاں ثابت ہوں گی اور بالآخر وہی ہم ہوں گے اور وہی امریکی غلامی کی زنجیریں۔ حالانکہ ایک بار پھر ہمیں نہایت مناسب موقع ملا ہے کہ امریکہ کے ساتھ تعاون کی شرائط واضح طور پر درج کی جائیں تا کہ ہماری بھی کوئی قانونی حیثیت ہو اور یکطرفہ مفادات کیاس جنگ میں جو ہم محض آلۂ کار بن کر رہ گئے ہیں، ہمی بھی بین الاقوامی قانون کوئی تحفظ دے۔ یہ کس طرح کا ساتھ ہے جس میں دل و جان پیش کر دینے پر بھی ہم خود انہی کے ہاتھوں محفوظ نہیں ہیں جن کی خاطر ہم نے خود کو اتنی بڑی مصیبت میں ڈال رکھا ہے؟ عوام یہ سوچنے میں حق بجانب ہیں کہ جو فوج خود کو امریکی دہشت گردی سے نہیں بچا سکی، وہ ہماری کیا حفاظت کرے گی اور شاید عوام کے اندر اپنی فوج پر یہی عدم اعتماد پیدا کرنا مقصود تھا۔

ایک بھونچال میمو گیٹ سکینڈل نے بھی اٹھائے رکھا۔ کیا حسین حقانی کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلانے والوں کا حقیقی احتساب ہو سکے گا؟ مگر اس سوال سے پہلے یہ سوال ہے کہ کیا اس سے پہلے ملک سے غداری کے مرتکب اور ملکی سلامتی کو داؤ پر لگانے والے مجرموں کے احتساب کی کوئی نظیر یہاں موجود ہے؟ اگر ہماری تاریخ میں ایک بار بھی ایسے جرائم بے رحم احتساب ہوا ہوتا تو آج ہم ایسے نت نئے واقعات کا سامنا نہ کر رہے ہوتے۔

بھارت کو پسندیدہ ترین ملک قرار دینے پر بھی عمومی اضطراب پایا جاتا ہے۔ اپنی معاشی بنیادو کو مضبوط کیے بغیر تجارتی تعلقات اور راہداریاں کھول دینا ہرگز ہمارے مفاد میں نہیں ہے۔ غیر مساوی معیشتوں کے درمیان تعلقات استوار کرنے کے لئے دونوں کو اصول وقواعد کا مساوی میدان فراہم کرنا ضروری ہے۔ اور ہماری موجودہ قیادت کے اندر نہ تو اتنی فراست پائی جاتی ہے اور نہ خودداری کہ بھارت جیسے دشمن ملک کے ساتھ، جسے امریکہ علاقائی طاقت بنانا چاہتا ہے، ساری باریکیاں مدنظر رکھتے ہوئے قومی مفادات کے مطابق ایسا تعلق نبھا سکے۔ اہل کشمیر کی فکرمندی الگ ہے۔ کل جماعتی کشمیر کانفرنس کے مشترکہ اعلامیہ میں حکومت پاکستان کے اس فیصلے کی مذمت کی گئی ہے۔ مسئلہ کشمیر پاکستان اور بھارت کے تعلقات میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مسئلہ کو حل کئے بغیر محبت کا یہ اظہار کشمیریوں کے زخموں پر نمک پاشی کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟ اسے نظرانداز کر کے باہمی تعلقات کے ضمن میں جو بھی فیصلہ کیا جائے گا، اس کے مضمرات ہمارے حق میں یقیناً اچھے نہیں ہوں گے۔

این آر او کیس کے سلسلے میں عدالتِ عالیہ کا فیصلہ قابل تحسین اور عوامی خواہشات کے مطابق ہے۔ سوئس بنکوں میں جمع لوٹی ہوئی دولت اس ملک کے عوام کی ہے اور تمام این۔ آر۔ او۔ زدہ کرپٹ اور مجرم سیاستدان قومی مجرم ہیں۔ ان کی معافی کسی صورت نہیں ہونی چاہیے۔ پیپلز پارٹی، ن لیگ اور ایم کیو ایم تینوں جماعتوں کو چاہیے کہ قومی مفاد کی خاطر از خود اپنی جماعتوں کے نامزد افراد کو عدالت کے حوالے کریں تا کہ خدا اور عوام کے سامنے سرخرو ہو سکیں۔

جناب مصطفیٰ صادق داغ مفارقت دے گئے۔تحریکِ پاکستان کے کارکن تھے۔سید مودودیؒ اور ملک نصراللہ خاں عزیز جیسی ہستیوں کی معیت میں علمی وصحافتی سفر کا آغاز کیا۔کہنہ مشق اور مدبر صحافی تھے۔سیاسی وصحافتی حلقوں میں نہایت فعال رہے۔روزنامہ تسنیم، ہفت روزہ المنیر ،المنبر ،روزنامہ آفاق اور وفاق کے ناشر و مدیر رہے۔ان کا بے باک قلم نہایت جرأت مندی سے قومی تاریخ کے ہر موڑ پر کلمۂ حق کہتا رہا۔تحریک تحفظ ختم نبوت ،تحریک نظام مصطفیٰ، شہادت ڈاکٹر نذیر احمد وخواجہ محمد رفیق، آغا شورش کاشمیری کی گرفتاری،''چٹان'' کی بندش ،نوائے وقت کے اشتہارات کی بندش، 1973ء کے متفقہ آئین کی تیاری، روزنامہ جسارت پر پابندی اور اس کے مدیر صلاح الدین کے علاوہ الطاف حسین قریشی اور مجیب الرحمٰن شامی کی گرفتاریاں ان تمام صحافتی وسیاسی معرکوں میں انہوں نے بھرپور اظہارِحق کیا اور حکومتوں کے ساتھ مذاکرات میں بے حد متحرک کردار ادا کیا۔اے پی این ایس اور سی پی این ای کی صدارت پر بھی رہے اور ضیاء الحق کی آخری کابینہ میں بھی وزیر امور عامہ کے طور پر خدمات انجام دیں۔

گزشتہ ماہ سید فاروق گیلانی کی بھی رحلت ہوئی جو سعد بن اسعد کے نام سے متعدد تحریروں کے مصنف تھے۔آپ معروف ادیب ودانشور سید اسعد گیلانی مرحوم کے صاحبزادے تھے۔

اللہ تعالیٰ مرحومین کی مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے اور بلند درجات عطا کرے۔آمین

صائمہ اسما

لین دین کے پیمانے

''تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں کے لئے ، جن کا حال یہ ہے کہ جب لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو انہیں گھاٹا دیتے ہیں'' (المطففّین ا تا ۳)

ناجائز افراد و تفریط کسی انسان میں ہو یا کسی قوم میں ، اخلاقِ حسنہ میں شامل نہیں ہے۔ اور کتنے بُرے ہیں وہ لوگ جو اپنے حق کو وصول کرنے کے لئے تو افراط سے کام لیتے ہیں اور دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں تفریط سے کام لیتے ہیں۔

بربادی ہے ان لوگوں کے لئے جو لینے کا موقع آئے تو پورا پورا بلکہ زیادہ لینے کی کوشش کریں اور جب دینے کی باری آئے تو کمی کرنے کی حتیٰ الامکان کوشش کریں۔ ناب تول میں کمی بیشی ، کے بارے میں اللہ رب العزت نے واضح احکام نازل فرمائے۔ حضرت شعیبؑ کی قوم کا انجام قرآن پاک میں مذکور ہے۔ تجارتی معاملات میں اللہ کے احکام سے سب واقف ہیں ..... انسانوں کے درمیان ایک اور ناپ تول کی کمی بیشی پائی جاتی ہے وہ ہے جذبات و احساسات کی۔ حقوق و فرائض کی۔ کچھ زیادتیاں نظر آنے والی ہوتی ہیں مثلاً روپے پیسے کا بھی کہیں نہ کہیں حساب کتاب ہوتا ہے۔ ظلم و تعدی، جسمانی تشدد بھی نظر آتا ہے جس کو دیکھ کر زیادتی کرنے والے کا ظلم اور مظلوم شخص کی تکلیف کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مگر وہ تکلیف ، وہ احساس ، وہ جذبہ ، کیفیت اور دکھ جس کو نہ دکھایا جاسکتا اور نہ ناپا تولا جاسکتا ہے ..... وہ رب کائنات جو دلوں کا حال جانتا ہے۔ اسی چھپی ہوئی کیفیت کا اندازہ خوب لگا سکتا ہے۔ اس دھاندلی اور افراط و تفریط کا بھی اُس رب کے سامنے جواب دینا ہوگا۔

''کیا ان کو خیال نہیں کہ اس بڑے بھاری دن کے لئے ان کو اٹھایا جائے گا جس دن سب لوگ کائنات کے رب کے سامنے کھڑے ہوں گے'' (المطففّین ۴ تا ۶)

اپنے معاشرے میں اس دھاندلی کا دائرہ بڑھتا جارہا ہے ..... حکومت ہو، ادارے کا سربراہ یا گھر کا سربراہ اپنے اپنے موقع محل سے لینے کے لئے پیمانہ اور رکھتا ہے اور دینے کے لئے پیمانہ اور ہے ..... محبت پیار ہو وفا کا تقاضا ہو، باہم حوصلہ افزائی ہو، درگزر کرنا ہو، الگ الگ پیمانے ہیں۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے کچھ اختیارات سے نواز دیا تو گویا کہ عزت نفس صرف اسی کے حصے میں ڈال دی گئی ہے ماتحت کوئی بھی ہو ادارہ ہو یا گھر عزت نفس سے محروم سمجھا جاتا ہے۔ میاں بیوی کے درمیان جذباتی کیفیات و احساسات ، عزت و احترامِ نفس برابر رکھی گئی ہے۔ مگر اکثر اس میزان میں خلل

ڈالا جاتا ہے اور اس کو روا سمجھ کر باقی رہنے دیا جاتا ہے۔ حقوق العباد کے حوالے سے معاشرت پہ غور کیا جائے تو ہر رشتہ دورے کا استحصال کرنے کی دانستہ یا نادانستہ کوشش کرتا ہے خصوصاً قانونی رشتوں میں یہ جھول واضح اور نمایاں ہے۔ لین دین کا معاملہ، مال و اسباب وتحائف۔ قدر و منزلت یا مبارک بادیوں کا ہی کیوں نہ ہو ''ناپ تول میں کمی'' کا شکار ہے۔ جذباتی کیفیات نظر نہیں آتیں مگر معاشرتی رویوں میں ان کا ہی عمل دخل دیرپا ہوتا ہے۔ روزانہ ذرا اپنے معاملات کا جائزہ لے کر دیکھا جائے تو صبح سے رات تک میزان میں خلل ہی نظر آئے گا..... اپنے کسی کارنامہ پہ داد وصول کرنے کا پیمانہ اور ہے۔ دوسروں کی کارکردگی پر حوصلہ افزائی کے معاملے میں تنگ دلی ہے..... دوسروں کا دل دکھا کر ''سوری'' کہہ دینے کا مختصر اور لاپرواہ سا تکلف ہے، بالمقابل سے کچھ غلطی ہو جائے تو باقاعدہ سزا کی مدت گزرنے کے بعد ''چلو معاف کیا'' کا احسان عظیم ہے..... کسی کے اچھے کام پہ تعریف میں بخل ہے۔ غلطی ہو جائے تو دل دکھانے اور ذلیل کرنے میں دل کشادہ ہے۔ انسان کی زبان سے ادا ہونے والے منتخب الفاظ اس کی اپنی شخصیت کا آئینہ دار ہوتے ہیں۔ زبان کی کاٹ، تلوار کی کاٹ سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ تلوار سے کٹنے کا زخم نظر آتا ہے۔ دنیا دیکھتی ہے زبان کا لگایا ہوا زخم روح کو گھائل کرتا ہے۔ روح نظر نہیں آتی وہ غیب ہے اور غیب کا حال اللہ جانتا ہے۔ جسمانی تکالیف کا کوئی نہ کوئی کفارہ دنیا میں ممکن ہے، روح کے گھائل ہونے کا کفارہ کس کے پاس ہے؟ ہر انسان اپنے تمام رشتوں کے حوالے سے یاد رکھے کہ وہ ''لینے'' کا پیمانہ کیسا رکھتا ہے اور ''دینے'' کا کیسا؟ اس مالک مختار و جبار کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی ہاتھ، زبان، جذبات و احساسات، حال، اسباب حقوق و فرائض کے دونوں پیمانے رکھے ہوئے تصور کریں۔ اور یاد کریں کہ اُس وقت جو میزان رکھی جائے گی وہ ہماری مرضی کی نہ ہوگی۔ اس کے سارے اختیارات اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوں گے۔

''لوگوں کے حق مارنے والے کیا قیامت کے دن سے نہیں ڈرتے جس دن یہ اس ذات کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے جس سے کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے'' کھڑے کئے جانے کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ ستر سال بغیر بولے چالے کھڑے رہیں گے۔ جب ایک دن کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہوگی۔'' (اسلامی خطبات از عبدالسلام بستوی)

آیئے اُس ہولناک دن کے آنے سے پہلے اپنے ''دل'' کی میزان سیدھی کرلیں۔ درست کرلیں اپنے پیمانوں کو، کشادہ کرلیں ذہنوں کو، شیریں کرلیں اپنی زبان کو۔

☆☆☆

غلطیوں کو معاف کرنا

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے روایت ہے، رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ میں تم کو یہ نہ بتاؤں کہ تم میں برے لوگ کون ہیں؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! جیسا آپؐ پسند فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا: تم میں بُرے وہ لوگ ہیں جو خدمت کریں تو صرف اپنی کریں، اور جوان کا خادم اور غلام ہو، اس کے ساتھ سختی کا برتاؤ کریں اور جو کچھ وہ دے سکتے ہیں اس کو روک کر رکھیں۔ پھر آپؐ نے فرمایا: کیا میں تم کو نہ بتاؤں اس سے بھی زیادہ بُرے لوگ کون ہیں؟ صحابہ کرامؓ نے کہا: ہاں، ضرور اگر آپ چاہیں اے اللہ کے رسولؐ۔ آپؐ نے فرمایا: وہ آدمی جو لوگوں کو ناپسند کریں اور لوگ ان کو ناپسند کریں، جن کو لوگوں سے کراہت آئے اور لوگوں کو ان سے کراہت آئے، جو لوگوں سے دشمنی رکھیں اور لوگ بھی ان کو دشمن سمجھیں اور ان سے دشمنی رکھیں۔

پھر آپؐ نے فرمایا: کیا میں نہ بتاؤں کہ اس سے بھی زیادہ بُرے لوگ کون ہیں؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ اگر آپ چاہیں تو ضرور بتائیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ وہ لوگ جو کسی دوسرے کی خطا سے درگزر نہیں کرتے، کوئی معذرت یا عذر قبول نہیں کرتے اور کسی کی غلطی کو معاف نہیں کرتے اور اس پر پردہ نہیں ڈالتے۔ پھر آپؐ نے فرمایا: کیا میں تم کو بتاؤں اس سے بھی زیادہ برا آدمی کون ہے؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: ضرور اے اللہ کے رسولؐ اگر آپ پسند فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا: جس سے بھلائی کی امید نہ رکھی جائے اور جس کے شر سے لوگ محفوظ نہ ہوں۔ (طبرانی)

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (۴۲:۴۰)

برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔

قرآن نے کہا کہ ہاں، برائی کا بدلہ لے سکتے ہو لیکن اس کے برابر جتنی تم سے زیادتی ہوئی ہو۔ یہ برابر کے بدلے کی شرط ایسی ہے کہ آدمی جتنا بھی سوچے اندازہ نہیں کر سکتا ہے کہ برابر کا بدلہ آخر کیا ہوگا۔ مال میں تو آدمی تول کے دیکھ سکتا ہے کہ برابر کا بدلہ کتنا ہے۔ ۱۰۰ روپے کے بدلے میں ۱۰۰ روپے لیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اگر کسی نے مارا تو کتنی چوٹ لگی، اگر کسی نے گالی دی تو کتنی ذلت ملی، اور اس کے جواب میں اگر گالی دی گئی تو دوسرے نے کتنی ذلت اٹھائی، اس کا کوئی وزن ہم دنیا کے اندر نہیں کر سکتے۔ ایک صحابیؓ حضورؐ کے پاس آئے اور کہا کہ میرے غلام اور نوکر ہیں۔ یہ خیانت بھی کرتے ہیں اور برا بھلا کام بھی۔ اس کے جواب میں، میں بھی ڈانٹ ڈپٹ کر لیتا ہوں اور کبھی مارتا بھی ہوں۔ میرا ان کا کیا معاملہ ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا تمہارے اعمال تمہارے لئے ہیں اور ان کے اعمال ان کے لئے۔ جو کچھ انہوں نے کیا اس کا حساب وہ دیں گے، اور جو کچھ تم نے کیا اس کا حساب تم دو گے۔ اگر یہ دونوں برابر ہوئے تو تم چھوٹ جاؤ گے لیکن اگر جو کچھ تم نے ان کے ساتھ کیا وہ زیادتی ہوئی تو پھر تمہیں اس کا بدلہ قیامت کے روز دینا پڑے گا۔ یہ سن کر وہ صحابیؓ اپنے آپ کو پیٹنے لگے اور کہنے لگے پھر تو میں تباہ ہو گیا۔ یہ کیسے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ

بدلے میں کس نے زیادتی کی۔ پھر وہ چلے گئے۔ اس کے بعد واپس آ کر انہوں نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! اب اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ میں ان سب کو آزاد کر دوں۔ کیونکہ میں نہیں جان سکتا کہ بدلے میں کس نے کتنی زیادتی کی۔ میں اللہ کے سامنے اس طرح نہیں جانا چاہتا کہ میں نے زیادتی کی ہو۔ لہٰذا بدلہ لینے کی اجازت ضرور ہے لیکن یہ اس پابندی کے ساتھ ہے۔ اسی لئے قرآن مجید نے یہ کہنے کے بعد کہ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ (الشوریٰ ۴۲:۴۰) ''یعنی کہ برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے، معاف کرنے کی ترغیب دی ہے:

وَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (۴۰) ''پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔''

معاف کرنے کا اللہ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے۔ پھر عذر قبول کرنے کا حکم ہے اور یہ کہا گیا کہ اگر تمہارا بھائی کوئی عذر پیش کرے کہ مجھ سے غلطی ہو گئی یا اس وجہ سے بات منہ سے نکل گئی، مِحِقًّا اَوْ مُبْطِلًا، یعنی وہ سچا ہو یا جھوٹا، اس کو قبول کرو۔

اگر کوئی کسی کے مال پر ناجائز قبضہ کر لے یا ناجائز ٹیکس لے، اس حوالے سے احادیث میں اس کی کڑی سزائیں بتائی گئی ہیں لیکن اس کی اجازت نہیں ہے کہ آدمی کسی کا عذر قبول نہ کرے۔ کسی سے خفا ہو کے تین دن سے زیادہ تعلقات کو ترک کر دینا جائز نہیں۔ بخاری و مسلم کی متفق علیہ حدیث ہے کہ کسی مسلمان کے بھائی کے لئے اپنے مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ ناراض رہنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ یہ جائز نہیں وہ سلام کرے تو منہ پھر لیا جائے۔

ایک روایت کے مطابق جمعرات کو سب کے اعمال خدا کے حضور پیش ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ شرک کے علاوہ تمام گناہ بخش دیتا ہے لیکن جو آدمی دوسرے آدمی سے ناراض ہو یا دشمنی رکھتا ہو، اس کے لئے وہ فرماتا ہے کہ اس کو دو دن کی مہلت دو۔ اگر یہ دو دن میں اپنے معاملات کو ٹھیک کر لے، معاف کر دے، اصلاح کر لے تو ٹھیک ہے، ورنہ یہ قابل معافی نہیں ہے۔

ہمارے ہاں جو یہ روش پائی جاتی ہے کہ بول چال نہیں ہے، مہینوں گزر گئے اور ترک تعلق ہے، اس کی کوئی گنجائش اسلام میں نہیں ہے۔

معاف کر دینے کے ضمن میں ایک اور اہم پہلو ہے جو ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہنا چاہیے اور جسے حضورؐ نے بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔

حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حضورؐ ہمارے درمیان بیٹھے ہوئے تھے اور بیٹھے بیٹھے آپؐ اچانک مسکرائے اور اتنا مسکرائے کہ سامنے کے دانت دکھائی دینے لگے۔ حضورؐ با آواز بلند قہقہہ لگا کر کبھی نہیں ہنستے تھے۔ آپؐ کی مسرت و خوشی کی انتہا یہ تھی کہ آپؐ اس طرح ہنستے تھے کہ دانت صاف دکھائی دیتے تھے۔ لوگوں نے پوچھا: اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ پر ہمارے ماں باپ قربان اور فدا ہوں، آپؐ کو کس چیز نے ہنسا دیا؟ حضرت عمرؓ نے بھی یہ سوال کیا کہ میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں، آخر کس چیز نے آپؐ کو خوش کیا کہ آپؐ مسکرا دیئے۔

آپؐ نے فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ میری امت کے دو آدمی اللہ کے حضور اپنا مقدمہ لیے زانو سے زانو لگائے ہوئے، اس کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک آدمی نے کہا اے رب! اس نے میرے اوپر ظلم کیا۔ اس کا بدلہ مجھے یہاں دلوایئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے کہا کہ تمہارے بھائی سے میں تمہیں کیا بدلہ دلواؤں، اس کے پاس تو کوئی بھی نیکی نہیں ہے کہ میں کچھ نیکیاں لے کر تمہیں دے دوں۔ اس نے

کہا پھر میرے گناہ لے کر اس کے اوپر ڈال دیں۔ یہ کہنے کے بعد حضورؐ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ بڑا عجیب دن ہوگا کہ جہاں آدمی کے لئے یہ بات بھی بڑی غنیمت ہوگی کہ وہ گناہوں کا جو بوجھ اپنی پیٹھ پر لاد کر لایا ہے، اس میں کچھ کمی ہو جائے۔

جب مدعی یہ کہے گا کہ اگر اس کے پاس دینے کے لئے نیکیاں نہیں ہیں تو آپ میرے کچھ گناہ لے کر اس کے حوالے کر دیجئے، تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اچھا! تم ذرا نگاہ اٹھا کر اوپر دیکھو۔ وہ نگاہ اٹھا کر اوپر دیکھے گا کہ ایک بڑی ہی عمدہ جگہ ہے۔ اس کے اندر سونے کے مکانات ہیں جو موتیوں سے مرصّع ہیں اور وہاں ہر قسم کی نعمتیں ہیں۔ وہ کہے گا کہ یہ کس کا محل ہے۔ شاید یہ کسی نبی کا ہے، کسی صدیق کا ہے یا کسی شہید کا ہے۔ یہ اتنا اعلیٰ مقام ہوگا کہ اسکے ذہن میں یہی آئے گا کہ اتنا اعلیٰ درجہ تو کسی نبی، صدیق یا شہید کو ہی مل سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ جو اس کی قیمت ادا کرے گا اس کو یہ مل سکتا ہے۔ اس نے پوچھا کہ اس کی قیمت کون دے سکتا ہے؟ کس کے پاس اتنی دولت ہے کہ وہ اس کی قیمت ادا کر سکے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اگر تو چاہے تو اس کی قیمت ادا کر سکتا ہے۔ وہ کہے گا کہ میرے پاس کیا رکھا ہے کہ قیمت دے سکوں؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اگر تو اس بندے کو معاف کر دے تو تجھے یہ مقام حاصل ہو سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ میں پھر اس کو معاف کرتا ہوں۔ یوں اللہ تعالیٰ نے دونوں کو جنت میں داخل کر دیا۔

آج اس دنیا میں جو آدمی معاف کرے گا، معافی کی روش پر چلے گا، قیامت کے دن اس کے لئے بخشش بھی ہے اور نہایت بلند درجات بھی۔ مگر اس کے لئے دل کی کشادگی اور وسعت قلبی ہونی چاہیے۔ اسی سے جیب بھی کھلتی ہے، اسی سے برتاؤ میں فیاضی آتی ہے اور حقوق کے معاملے میں بھی آدمی کم لینے پر راضی ہو جاتا ہے اور زیادہ دینے پر اصرار کرتا ہے۔ اسی سے زندگی کے اندر احسان، محبت، چاشنی، مٹھاس اور شیرینی اور اس زندگی کا حسن و جمال پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا فیاضی اگر ایک طرف راہ خدا میں مال دینا اور صدقہ کرنا ہے اور ہر قسم کی نیکی کرنا ہے، تو دوسری طرف لوگوں کی غلطیوں کو کھلے دل سے معاف کرنا اور کوتاہیوں سے صرف نظر کرنا بھی ہے۔ یہ ہمارے ایمان کا تقاضا ہے کہ ہم کھلے دل سے دوسروں کی غلطیوں کو معاف کریں۔

☆☆☆

ڈاکٹر بشریٰ تسنیم

بدعاتِ محرم

محرم الحرام کا اصل پیغام یہ ہے کہ حق کا بول بالا کرنے کو مقصدِ زندگی بنایا جائے

قرآن پاک کی سورۃ توبہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

''حقیقت یہ ہے کہ مہینوں کی تعداد جب سے اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے اُس کے (اللہ تعالیٰ کے) نوشتہ میں بارہ ہی ہے۔ اور ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں (رجب، ذیقعد، ذالحج، محرم)۔ یہی ٹھیک ضابطہ ہے (کیلنڈر کا) لہٰذا ان چار مہینوں میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو اور مشرکوں سے سب مل کر لڑو۔ جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں اور اچھی طرح جان لو کہ اللہ تعالیٰ متقیوں کے ہی ساتھ ہے (یعنی متقیوں کا حق ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا ساتھ دے) ان چار مہینوں میں محرم کی اہمیت مزید رسول ﷺ کے اقوال مبارکہ سے بھی عیاں ہوتی ہے۔ محرم کا معنی ہے بہت زیادہ قابل تعظیم، ان مہینوں کی حرمت ابتدائے آفرینش سے ثابت ہے۔''

حج الوادع میں نبی ﷺ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا۔

''لوگو! زمانہ گھوم پھر کر اپنی اصلیت پر آ گیا ہے۔ سال کے بارہ مہینے ہوا کرتے ہیں۔ جن میں سے چار حرمت والے ہیں۔'' (مسلم)

اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ کیلنڈر کے مطابق سال کی ابتدا محرم الحرام سے ہوتی ہے۔ کیونکہ اس مقدس مہینے کی عظمت کون و مکاں کی پیدائش کے ساتھ وابستہ ہے۔

(''غنیۃ الطالبین'' از حضرت عبدالقادرؒ جیلانی صفحہ نمبر 676 میں درج ہے محرم کی عظمت اور اس کا حوالہ شیخ الحدیث مولانا عبدالسلامؒ بستوی نے ''اسلامی خطبات'' از مکتبہ سلفیہ میں نقل کیا ہے واللہ اعلم)

اسی مہینے میں اللہ تعالیٰ نے زمین، آسمان، پہاڑ، سمندر، لوح و قلم، حضرت جبرئیلؑ اور دیگر فرشتوں کو پیدا کیا۔ اسی ماہ حضرت آدمؑ کی تخلیق ہوئی اور ان کی توبہ قبول کی گئی .....

عاشورہ محرم میں حضرت نوح علیہ السلام کو طوفان سے نجات دی۔ حضرت ابراہیمؑ کی پیدائش اور ان کی نارِ نمرود سے نجات ہوئی، آگ، گلزار بنائی گئی اسی مہینے دس محرم کو فرعون غرق ہوا۔ حضرت یونسؑ مچھلی کے شکم سے باہر آئے۔ حضرت ادریسؑ مکانِ عُلیا پہنچے۔ حضرت ایوبؑ کو شفا نصیب ہوئی۔ حضرت داؤدؑ کی توبہ قبول ہوئی حضرت سلیمانؑ کو سلطنت ملی۔ عاشورہ محرم میں اللہ تعالیٰ عرش پہ جلوہ گر ہوا۔ اسی مہینے قیامت آئے گی .....(ملخص الحدیث از غنیۃ الطالبین)

اسلام سے پہلے لوگ عاشورہ محرم کا روزہ رکھتے تھے اور اس کے خاتمہ پر عید کی خوشی مناتے تھے۔ ابتدائے اسلام میں عاشورہ محرم کا روزہ فرض تھا۔ جب رمضان المبارک کا روزہ فرض ہو گیا تو عاشورہ محرم کے روزے کی فرضیت منسوخ کر دی

گئی۔البتہ مستحب تسلیم کیا گیا۔

جب حضورﷺ مدینہ تشریف لے گئے تو انہوں نے یہودیوں کو عاشورہ محرم کا روزہ رکھتے دیکھا، آپ نے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ ہماری فرعون سے نجات کا دن ہے.....اس دن حضرت موسیٰؑ نے شکرانے کے طور پر روزہ رکھا۔آپﷺ نے فرمایا۔

''حضرت موسیٰؑ کے ساتھ موافقت رکھنے میں (ان کی خوشی میں شریک ہونے کے) ہم زیادہ حق دار ہیں۔آپ نے خود بھی روزہ رکھا اور اپنے ساتھیوں کو بھی عاشورہ محرم کا روزہ رکھنے کی تلقین کی۔''(بخاری ومسلم)

یہودیوں کے ساتھ مشابہت سے بچنے کی خاطر آپؐ نے فرمایا اگر میں اگلے سال دنیا میں موجود ہوا تو محرم کی نو اور دس تاریخ کو روزہ رکھوں گا۔آپؐ اگلے سال اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے لیکن آپ کی تاکید اور حکم باقی رہا۔صحابہ کرامؓ نے اس ارشاد پر عمل کیا اور دسویں کے ساتھ نو یا گیارہ تاریخ کا روزہ رکھا۔

دسویں محرم کا روزہ رکھنا کس قدر اہمیت کا حامل ہے کہ حضور اکرمﷺ نے ارشاد فرمایا رمضان المبارک کے بعد محرم الحرام کا روزہ رکھنا افضل ہے (مسلم)

اور فرمایا کہ عاشورہ کے دن روزہ رکھنے سے ایک سال کے گناہ (حقوق اللہ) معاف ہو جاتے ہیں (مسلم)

یہ تو ہے محرم اور عاشورہ محرم کی اہمیت کتاب وسنت کی روشنی میں۔مگر مسلمانوں کی اکثریت محرم اور عاشورہ محرم کے بارے میں یہی خیال کرتی ہے کہ اس کا تعلق صرف حضرت امام حسینؓ سے ہی وابستہ ہے۔

افسوس کی بات تو یہ ہے کہ شیعہ حضرات کے ساتھ دیگر مسالک کے مسلمان بھی بہت سی بدعات میں مبتلا ہو رہے ہیں اور ہر سال ان بدعات اور افراد کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

اکثر مسلمان گھرانے شش و پنج میں مبتلا نظر آتے ہیں کہ ہم اپنی اولادوں کو کیا جواب دیں؟ سکول، کالج کے طالب علم بہت سے سوال کرتے ہیں والدین ان کو بدعات کی درست تفہیم سے آگاہ کرنا نہیں جانتے .....'' کیا حرج ہے.....ایسا کیا برا ہے؟.....محبت ہی تو کرتے ہیں''، قسم کے ڈھارس بندھانے والے جملوں کے سوا کچھ نہیں سوجھتا..... ایسی محفلوں میں شریک ہونے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی جاتی جہاں اعلانیہ بدعات کا دور دورہ ہوتا ہے۔بلکہ اب تو سنی گھرانوں میں بھی مجالس ومحافل اور جلوس وتقریبات کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔

بدعاتِ محرم

روزہ رکھنے کی بجائے عصر کے بعد کا فاقہ کرنا نوحہ اور ماتم، گریہ وزاری، سوگ میں کالے کپڑے پہننا، رشتہ طے نہ کرنا۔محرم میں شادی نہ کرنا، نئے کپڑے نہ سلوانا نہ پہننا، کپڑے الٹ کر کے پہننا، بستر کی چادریں الٹی کر کے بچھانا چارپائی الٹ کر رکھنا وغیرہ وغیرہ۔

آنحضرتﷺ نے فرمایا۔

''جو ماتم کرے، رخسار اور منہ پیٹے، گریبان پھاڑے، جاہلیت کی طرح بین ڈالے، وہ ہم میں سے نہیں۔میں اس

امام حسینؓ کی شہادت کے بعد دنیا میں سب سے پہلے نوحہ و ماتم کرنے والا بقول شیعہ حضرات کے خود یزید تھا۔

سے بے زار ہوں جو ماتم میں سر کے بال مونڈے یا بلند آواز سے روئے یا کپڑے پھاڑے (بخاری و مسلم)

آنحضورﷺ نے نوحہ کرنے والی اور اس محفل میں شامل ہو کر غور سے سننے والی عورت پر لعنت بھیجی ہے (ابو داؤد)

دو باتیں مسلمانوں میں کفر کی ہیں۔نسب میں طعن کرنا اور میت پر نوحہ کرنا (مسلم)

تمام امت کے علماءِ حق کا اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ نوحہ اور جاہلیت کے طریقہ پر بین کرنا حرام ہے۔

علامہ ابن حجر مکی صواعق محرمہ میں فرماتے ہیں کہ

''اس بات کی بہت تاکید ہے کہ انسان روافض کی بدعات میں مشغول ہونے سے پرہیز کرے،نوحہ، ماتم، بین ڈالنے سے بچے اس لئے کہ یہ سب اعمال و افعال شائستہ ایمان والوں کے اخلاق کے منافی ہیں۔اگر نوحہ وغم جائز ہوتا تو رسولﷺ کی وفات کا دن اس کا زیادہ حق دار تھا (حضور اکرمؐ کی وفات کا دن 12 ربیع الاول ہے حوالہ از محسن انسانیت نعیم صدیقیؒ۔اس دن تو نبیؐ کی محبت کے دعوے دار چراغاں کر رہے ہوتے ہیں)۔شاہ عبدالحق محدث دہلوی شرح ''سفرالسعادت'' میں صفحہ 673 میں لکھتے ہیں کہ ''اہل سنت کا دستور یہ ہونا چاہیے کہ عاشورہ محرم کو فرقہ رافضیہ کی نکالی ہوئی بدعات مثلاً مرثیہ، ماتم و نوحہ وغیرہ سے احتیاط کریں یہ کام مومنوں کے نہیں ہیں.....اگر ایسا جائز ہوتا تو نبی اکرمؐ کی وفات کا دن سب سے زیادہ غم کا دن ہے۔''

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ منہاج السنہ میں فرماتے ہیں۔

''رافضیوں نے عاشورہ محرم کو ماتم کا دن بنا لیا ہے۔ نوحہ کے شعر و اشعار پڑھتے ہیں، پیاسے رہتے ہیں، رخساروں پر طمانچے مارتے ہیں، گریبان اور کپڑا پھاڑتے ہیں، کفار کی طرح چیختے چلاتے ہیں ..... یہ سب بدعات ہیں۔(ابن تیمیہؒ جیسے بزرگوں کی رخصت کے بعد اب کیا کیا بدعات فرائض میں شامل ہوگئی ہیں قل، چالیسواں، ماتم کے خون خوار طریقے) حالانکہ ماتم و گریہ زاری، خود پہ ناروا پابندیاں شرعاً و عقلاً معیوب اور مذموم ہیں سوگ کے بارے میں واضح احکامات و طریقے موجود ہیں۔

حضورﷺ نے فرمایا

''جو عورت اللہ پر، قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہے اس کے لئے جائز نہیں کہ میت پر تین دن سے زیادہ سوگ کرے۔ہاں اپنے خاوند کے فوت ہونے پر وہ چار ماہ دس دن سوگ کرے۔'' (بخاری و مسلم)

گویا کسی بھی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ حرام ہے.....اور بیوہ عورت پر بھی چار ماہ دس دن سے زیادہ کا سوگ نہیں۔اس مدت کے بعد اُس کا سوگ میں رہنا حرام ہے۔

خلافِ سنت کام کرنا ہر مسلمان کے لئے منع ہے۔ہر وقت ہر لمحہ اسوہِ رسولؐ کی پیروی لازمی ہے۔مگر حرمت کے

مہینوں میں اپنا احتساب اور جائزہ لیتے رہنا زیادہ ضروری ہے۔خصوصاً ان خرافات اور بدعات سے بچنے کا خصوصی اہتمام کرنا چاہیے جو خاص دنوں میں رائج ہو گئے ہیں۔ کیونکہ شیطان نے جن بدعات کے ذریعے مسلمانوں کو اپنا نشانہ بنا رکھا ہے اس کا مقابلہ کرنا اپنے ایمان کو بچانے کے لئے لازمی ہے۔

عشرہ محرم میں زیب و زینت سے دور رہنا، شادی نہ کرنا، اظہارِ غم میں ننگے سر ننگے پاؤں یا ننگے بدن رہنا شیطانی سوچوں کا نتیجہ ہیں۔

حضورؐ ایک بار جنازے پر تشریف لے گئے آپؐ نے کچھ لوگوں کو دیکھا انہوں نے اظہارِ غم کے لئے اپنے اوپر سے چادریں اتار رکھی ہیں۔آپؐ نے فرمایا۔

''کیا تم جاہلیت کا کام کرتے ہو، جاہلیت کی رسم کی مشابہت کرتے ہو'' (سند احمد)

کفار سے ملتی جلتی رسمیں چاہے وہ خوشی کی ہوں یا غم کی مسلمانوں کے لئے ہرگز جائز نہیں ہیں۔مرنے والے کی مرثیہ خوانی کے بارے میں ارشادِ نبوی ہے۔

''مرثیہ خوانی سے دور رہو.....'' (ابن ماجہ)

مرثیہ خوانی کرتے کرتے لوگ ہجو پر اتر آتے ہیں۔ ایک کی محبت میں شدت ظاہر کرنے کے لئے دوسروں کی ہتک کرتے ہیں۔

حضورؐ نے فرمایا۔

''میرے اصحاب کو گالی مت دینا'' (بخاری و مسلم)

''ڈرو اللہ تعالیٰ سے میرے اصحاب کے بارے میں (تین بار ارشاد فرمایا)

''ان کو میرے بعد نشانہ مت بنالینا (یعنی ان کی برائی نہ کرنا) جو ان کو دوست رکھتا ہے وہ مجھے دوست رکھتا ہے۔جو ان سے دشمنی رکھتا ہے تو گویا وہ مجھ سے دشمنی رکھتا ہے۔''

علامہ نوویؒ شارح مسلم میں تحریر فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کو گالی دینا حرام ہے۔علامہ غزالیؒ احیاء العلوم میں فرماتے ہیں۔

صحابہؓ کے باہمی اختلافات اور نزاعات کو مجالس میں بیان نہیں کرنا چاہیے۔کیونکہ یہ (بشری کمزوریوں کو زیر بحث لانے سے) صحابہ کرامؓ کے بارے میں کینہ پیدا کرنے کا باعث ہے۔ہم تک دین ان کے ذریعہ سے پہنچا ہے..... صحابہ کرامؓ ہمارے محسن ہیں۔حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ

''ان محفلوں میں شامل ہونا (چاہے کسی بھی نیت سے ہو مثلاً دوستی نبھانا) درست نہیں جہاں بزرگوں کی ہجو کی جاتی ہو..... واقعات میں اپنی مرضی سے کمی بیشی کر کے سنایا جاتا ہو، فرضی داستانیں سنائی جاتی ہوں۔بدعتی مجالسی میں شریک ہو کر ان کی تعداد بڑھانا بدعتی عمل میں شراکت ہی ہے۔''

''جو شخص کسی قوم کے مجمع کو بڑھائے وہ اسی میں سے ہوگا اور کسی بدعتی کے کام کو پسند کرے وہ اسی کام میں شریک ہوگا (فتاویٰ عزیزیہ جلد اول صفحہ 72,71)

''جو کسی قوم سے مشابہت رکھتا ہے وہ اسی کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔'' (ابوداؤد)

اسی طرح نذر و نیاز کے حوالے سے غیر اللہ کا نام لیا

جانا بھی کافرانہ روش ہے۔

وہ کھانا اسی طرح حرام ہے جیسے سُؤر کا گوشت کھانا حرام ہے۔

''تمہارے لئے حرام کیا گیا ہے مردار، خون، سُؤر کا گوشت اور جس چیز پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔'' (البقرہ)

ایسی نذر ماننا بھی حرام ہے اور کسی اور کی طرف سے ایسے کھانے کو لینا اور کھانا بھی حرام ہے۔ حدیث ہے

اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے کاموں میں نذر کو پورا مت کرو (ابوداؤد) حضرت امام حسینؓ نے جس گھر میں تربیت پائی وہ نمونے کا گھر تھا۔ اور حضرت امام حسینؓ کے بارے میں حضور اکرم ﷺ نے جس محبت کا اظہار فرمایا اس کو سامنے رکھتے ہوئے ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ وہ بھی خانوادۂ رسولؐ سے محبت و تعظیم میں کمی نہ کرے.....اس لئے کہ اس گھرانے کو دنیا و آخرت میں فلاح و سعادت کی خوشخبریاں سنائی گئیں ۔ پدرانہ محبت کی تسکین جن نفوس میں حضورؐ نے پائی وہ ہمارے لئے قابلِ احترام و محبت ہیں ۔ صحابہ کرامؓ اور خلفائے ثلاثہ (حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ و عثمانؓ) نے ان سب نفوسِ قدسیہ کی ایسی ہی عظمت و توقیر کی جیسا کہ ان کا حق تھا۔ آپس میں ان سب کی رشتہ داریاں تھیں۔ تو آج جو حضرت امام حسینؓ کے حقوق کے غاصب بنا کر پیش کئے جاتے ہیں ان کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ وہ امام حسینؓ کے رشتہ دار بھی تھے ۔ ان سے حضرت فاطمہؓ حضرت علیؓ اور امام حسنؓ و حسینؓ کی قرابت داری اور محبت کے رشتے قائم تھے.....وہ ان صحابہ کرام کی شان میں گستاخی کر کے امام حسینؓ کی نظر میں کیا مقام بنا رہے ہیں ۔ حضرت امام حسنؓ اور حسینؓ جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں (ترمذی) یہ دونوں میرے دنیا کے دو پھولہیں (بخاری)

علیؓ، فاطمہؓ، حسنؓ و حسینؓ سے جو جنگ کرے گا، میں بھی ان سے جنگ کروں گا۔ جو ان سے صلح رکھے گا میں بھی ان سے صلح رکھوں گا (ترمذی)

حضرت فاطمہؓ جنت کی عورتوں کی سردار ہیں (ترمذی)

یہ پورا گھرانہ انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر سب مسلمانوں کے لئے مشعل راہ ہے کیونکہ حضور اکرمؐ نے ان سب پر خصوصی شفقت فرمائی اور تربیت میں سب سے زیادہ حصہ ان کو ہی ملا۔ اسی تربیت و تعلیم کا ہی نتیجہ تھا کہ ان کی زندگی حق کے لئے وقف تھی اور حق کی خاطر انہوں نے جان قربان کر دی اور اپنی شہادت سے پہلے حضرت امام حسینؓ نے وصیت فرمائی تھی جو اسوہ حسینؓ میں درج ہے۔

''میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ جب دشمن کے ہاتھوں قتل کر دیا جاؤں تو میرے ماتم میں گریبان چاک نہ کرنا، اپنے رخساروں پر طمانچے نہ مارنا، اپنے منہ کو زخمی نہ کرنا۔'' (اسلامی خطبات جلد اول۔ صفحہ 633)

حضرت امام حسینؓ کی یہ وصیت اپنے نانا محمد ﷺ کی تعلیمات کے عین مطابق تھی.....مگر وہ کیا عوامل تھے کہ اس وصیت کی خلاف ورزی شروع ہوئی اور پھر اس خلاف ورزی میں اضافہ ہوتا چلا گیا جو تا حال جاری ہے۔

امام حسینؓ کی شہادت کے بعد دنیا میں سب سے پہلے نوحہ و ماتم کرنے والا بقول شیعہ حضرات کے خود یزید تھا۔

ملا جعفر اپنی مشہور کتاب جلاء العیون میں لکھتے ہیں کہ

''جب اہل حسینؓ کا قافلہ کوفہ سے دمشق آیا اور یزید کے دربار میں پیش ہوا تو یزید کی بیوی ہندہ بے تاب ہو کر بے پردہ دربار یزید میں چلی آئی۔ یزید نے دوڑ کر اس کے سر پر کپڑا ڈال دیا اور کہا کہ گھر کے اندر جاؤ اور آلِ رسولؐ پر نوحہ و ماتم کرو۔ ابن زیاد نے ان کے بارے میں عجلت سے کام لیا۔ میں قتلِ حسینؓ پر ہرگز راضی نہ تھا۔'' (جلا العیون صفحہ 256)

اہل بیت یزید نے زیور اتار کر لباس ماتم پہنا، صدائے گریہ و ماتم بلند کیا، یزید کے گھر تین روز تک ماتم برپا رہا (جلاء العیون صفحہ 256)

نواسخ التاریخ صفحہ 278 اور منہج صفحہ 328 میں اسی طرح کے ماتم کا ذکر کیا ہے۔ امام حسینؓ پر نوحہ و ماتم کا پہلا دن تھا جو یزید کے محل میں برپا ہوا۔

قتل حسینؓ سے بری الذمہ ہونے کے لئے یزید نے ''چور مچائے شور'' والا معاملہ کیا۔ یزید کے انتقال کے بعد دوسرا شخص مختار ثقفی ہے جس کے متعلق حضورؐ نے ناپسندیدگی کے ساتھ ذکر کیا اور اس نے امام حسینؓ کی شہادت کو اپنے حق میں مفاد کی خاطر عجیب رنگ دیا کہ مرثیہ خوانی، نوحہ خوانی کی مجالس کا اہتمام کیا اور محبتِ حسینؓ ہونے کی ایسی بدعتی رسوم کو تاویل بنایا 67ھ میں اس کا انتقال ہوا۔

تیسرا شخص معز الدولہ ہے جس نے سب سے پہلے بغداد میں بزور حکومت عشرہ محرم میں نہایت دھوم دھام سے رسمِ ماتم منائی اور مخالفین (نام نہاد) پر زبانِ طعن و دشنام کا اضافہ کیا (تاریخ ابن خلدون جلد 3 صفحہ 425) معز الدولہ نے حکم دیا کہ سب دوکانیں بند کر دی جائیں۔ خرید و فروخت کا کام روک دیا جائے..... لوگ ماتم کریں، کمبل کا لباس پہنیں، عورتیں پراگندہ بال اور بین کرتی ہوئی، سینے پہ دوہتڑ مارتی ہوئی شہر کا چکر لگائیں۔ (کامل ابن اثیر جلد دوم صفحہ 197)

سید امیر علی ''سپرٹ آف اسلام'' میں صفحہ 461 پر لکھتے ہیں کہ معز الدولہ نے بیادگار شہادت امام حسینؓ و دیگر شہدائے کربلا، عاشورہ محرم کو ماتم کا دن مقرر کیا۔ مولوی اعجاز حسین شیعی اپنی کتاب مرقع کربلا میں صفحہ 78، 79 میں بحوالہ تاریخ الخلفاء تسلیم کرتے ہیں کہ معز الدولہ پہلا بادشاہ مذہب امامیہ پر تھا اور اس نے سرکاری طور پر ماتم کا اہتمام کیا۔ یزید کے گھر سے شروع ہوتی یہ بدعت مختار ثقفی اور معز الدولہ کے ذریعے یہاں تک آ پہنچی..... اب وہ ایک مذہبی فریضہ بن گیا ہے۔ جس میں شیعہ کے علاوہ دوسرے مسلمان بھی ملوث ہو گئے ہیں۔ امام زین العابدین نے جب دیکھا کہ کوفہ کے لوگ ماتم و گریہ میں مبتلا ہیں تو فرمایا۔

''یہ لوگ رو رہے ہیں حالانکہ ان ہی لوگوں نے ہم کو قتل کیا ہے۔'' (احتجاج۔ طبری صفحہ 156)

ماتم کے علاوہ ایک خاص رسم تعزیہ داری ہے۔ تعزیہ کے لغوی معنی کسی مصیبت زدہ کو صبر کی تلقین کرنے اور اس کے لئے تسکین کی دعا کرنے کے ہیں۔ کسی کی موت پر صبر کی تلقین کرنا، ڈھارس بندھانا تعزیت کرنا کہلاتا ہے محرم کا تعزیہ یوں ہے کہ امام حسینؓ کے روضہ مبارک کی ایک نقل تیار کی جاتی ہے جس کو سجایا جاتا ہے..... ہزاروں مرد اور عورتیں اس کے پاس دست بستہ تعظیم کے لئے کھڑے ہوتے ہیں۔ جھک جھک کر

سلام وسجدہ کرتے ہیں اور اپنی منتیں، مرادیں، دعائیں کرتے ہیں..... اس کے زیر سایہ آنے کے لئے، اس کو ہاتھ لگانے کے لئے خلقت ٹوٹی پڑتی ہے کہ آفات و بلیات کے دور ہونے، اور مرادیں پوری ہونے کا یہی ذریعہ ہے (استغفر اللہ)

مولانا شاہ عبدالعزیز دہلویؒ تحفہ اثناعشریہ باب گیارہ میں رقم طراز ہیں کہ ''کسی چیز کی صورت اور نقل کو اصل ٹھہرالینا ایک وہم ہے (دنیا میں بت پرستی کا پہلا قدم اسی وہم کا نتیجہ ہے) شیعہ حضرات بھی اسی وہم میں مبتلا ہیں یہ حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور حسنؓ و حسینؓ کی قبروں کی نقل بنا کر خیال کرتے ہیں کہ یہ ان کی نورانی قبریں ہیں..... فاتحہ و درود و سلام پیش کرتے ہیں، سجدے کرتے ہیں، مکھیوں سے بچانے کے لئے مورچھل ہلاتے ہیں۔ (مختصر از تحفہ)

شرکیہ رسم کیسے چلی؟

علامہ جلدل الدین سیوطی تاریخ الخلفاء صفحہ 277 میں ذکر کرتے ہیں کہ 341ھ میں ایک گروہ جو تناسخ کا قائل تھا، ظاہر ہوا۔ ان میں سے ایک نوجوان شخص نے دعویٰ کیا کہ حضرت علیؓ کی روح اس کے اندر حلول کر گئی ہے اور اس کی بیوی کا دعویٰ تھا کہ حضرت فاطمہؓ کی روح اس کے اندر آ گئی ہے۔ اسی گروہ کے ایک شخص نے دعویٰ کیا کہ وہ خود جبرئیل ہے۔ خلیفہ وقت کو معلوم ہوا (مطیع باللہ القاسم) تو اس نے ان لوگوں کو عبرت کا نشان بنانے کا حکم دیا۔ تب اس گروہ نے مکر و فریب سے کام لے کر خود کو اہل بیت کے ساتھ منسوب کر لیا..... معزالدولہ شیعی نے ان کو سفارش کر کے بچا لیا۔

معزالدولہ کی نسبت امام سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ ''یہ اُس کے لغتی کاموں میں سے ہے یاد رہے یہ وہ ہی شخص ہے جس نے میلاد کی محافل برپا کرنے کی رسم سرکاری طور پر ابتدا کی تھی۔ علامہ سیوطیؒ نے اپنی کتاب میں مزید لکھا کہ

معزالدولہ کے بعد اس کے بیٹے عزالدولہ نے مذہب شیعہ امامیہ کی ترویج کی اور اسی نے اذان میں کلمہ بڑھایا ''حیّ علی خیر العمل'' اس کے معاون جعفر بن فلاح نے اس کو دمشق میں پھیلا دیا۔ تابوت سکینہ یا امیر کی کرسی کے متعلق علامہ عبد الکریم شہرستانی الملل والنحل کے صفحہ 84 میں درج کرتے ہیں کہ

''وہ ایک پرانی کرسی تھی جو طفیل بن جعدہ کسی روغن فروش کی دوکان سے اٹھالایا تھا اور اس سے حضرت علیؓ کا کوئی تعلق نہ تھا۔ جس پر مختار ثقفی نے ریشمی غلاف چڑھا کر اور خوب آراستہ کر کے ظاہر کیا کہ حضرت علیؓ کے توشہ خانہ سے ملی ہے..... جب کسی دشمن سے جنگ کرتا تو صف اول میں اس کرسی کو رکھ دیتا اور لشکر سے کہتا کہ یہ تابوتِ سکینہ تمہارے درمیان بنی اسرائیل کے تابوت کی مانند ہے۔ اس سے دلوں کی تقویت و تسکین ملتی اور فرشتوں کے نزول کا موجب ہے (الملل والنحل صفحہ 84) مزید لکھتے ہیں کہ تیموری عہد میں چونکہ بادشاہ، وزراء اور سب اشرافیہ شیعہ تھے، وہ اپنی سیاسی وحکومتی مصروفیات کی بنا پر ہر سال کربلا نہیں جا سکتے تھے..... امیر تیمور نے کربلا سے امام حسینؓ کے روضہ کی نقل کرا کے، زیارات کا ثواب گھر بیٹھے حاصل کرنا آسان کر دیا۔ ایک اور

بات قابل غور ہے کہ اسی زمانے میں احادیث کے وضع کرنے کا رجحان زوروں پر تھا۔

خطیب بغدادیؒ نے ایسے متعدد افراد کے اعترافات نقل کئے ہیں جو انہی گمراہ فرقوں میں سے کسی فرقہ سے تعلق رکھنے والے تھے۔ بعد میں جب ان کو توبہ کی توفیق ہوئی تو انہوں نے اس فتنہ گری کی نوعیت سے لوگوں کو آگاہ کیا کہ جب ہم چاہتے کہ اپنی کسی بدعت کو دین ثابت کریں (کیونکہ قرآن میں تحریف کرنا ممکن نہ تھا) تو سب سے زیادہ سہل طریقہ یہ تھا کہ اس کو حدیث کا جامہ پہنایا اور لوگوں میں پھیلا دیا۔ اس طرح جو جھوٹ پھیلایا گیا اس کی مقدار معمولی نہیں ہے بلا مبالغہ لاکھوں کی تعداد بنتی ہے۔ مثلاً ایک صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے حماد بن زید سے سنا کہ زنادقہ نے بارہ ہزار حدیثیں گھڑ کر پھیلا دیں (الکفایۃ فی علم الروایۃ از مبادی تدبر حدیث از امین احسن اصلاحی)

حماد بن زید۔ جعفر بن سلیمان سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے مہدی سے سنا کہ وہ لکھتے تھے کہ زنادقہ میں سے ایک شخص نے خود میرے سامنے اقرار کیا کہ اس نے چار سو روایتیں گھڑیں اور لوگوں میں پھیلا دیں (الکفایۃ فی علم الروایۃ مبادی تدبر حدیث، از امین احسن اصلاحی)

اسی ضمن میں عاشورہ کی بابت یہ حدیثیں پھیلائی گئیں کہ جو شخص عاشورہ کے دن اپنے اہل و عیال کو کھانے اور کپڑے کی وسعت کرے تو اللہ تعالیٰ سارا سال فراخی عطا کرتا ہے جو عاشورہ کو سرمہ لگائے سارا سال آنکھوں میں درد نہ ہوگا۔

جو عاشورہ کو غسل کرے سارا سال بیمار نہ ہوگا۔

یہ سب موضوع الحدیث ہیں۔ جو لوگوں نے اپنی بدعات کو مستحکم و قابل قبول کرنے کو وضع کی تھیں اس صورتحال کو سامنے رکھ کر یہ بات ذرا بھی تعجب انگیز معلوم نہیں ہوتی کہ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے لاکھوں حدیثوں کے انبار میں سے چند ہزار حدیثیں پائی ہیں جن سے مجموعے تیار ہوئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان قدسی نفوس کے درجات بلند فرمائے جنہوں نے بدعات اور جاہلیت کے اندھیروں میں سنت و شریعت کے چراغ روشن کئے .....لیکن اب بھی ایسے ایسے کام مذہب کے نام پر کئے جاتے ہیں جن میں مشرک اقوام سے بدرجہا مشابہت پائی جاتی ہے۔

خود اپنے ہاتھوں سے نقلی چیزیں بنا کر ان کی پرستش کرنا ..... بت پرستی نہیں تو کیا ہے؟ صرف چیزوں اور شکلوں کا فرق ہے.....ورنہ بت پرستی اور کیا ہوتی ہے؟ شرک یہی کچھ تو کہلاتا ہے.....

سورۃ توبہ کی آیت جس میں مہینوں کی حرمت کا ذکر ہے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

''ان مہینوں میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو.....اور مشرکوں کے خلاف متحد ہو کر لڑو۔''

''ظلم'' کو قرآن میں شرک سے بھی تشبیہہ دی گئی ہے۔

اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (لقمان)

بے شک اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک، ظلم عظیم ہے۔

محرم مہینوں میں خصوصاً محرم الحرام میں شرک کے

مناظر اُتنے ہی زیادہ ہیں تو مشرکوں کے خلاف لڑنے کون اٹھے گا؟ مسلمان خود کسی نہ کسی طور پر شرک میں مبتلا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

''جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرے گا اللہ تعالیٰ اُس کے اوپر جنت حرام کر چکا.....اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور ظالموں (مشرکوں) کا کوئی مددگار نہ ہوگا (المآئدہ)

مشرک صرف بت کو پوجنے والے، نبی کو بیٹا بنانے والے، ستاروں اور دیگر مخلوق اور مادی اشیاء کی پرستش کرنے والے نہیں ہوتے، قبروں، تعزیوں، اماموں کے ساتھ وابستگی ویسی جیسی کہ اللہ تعالیٰ سے ہونی چاہیے، بھی سراسر شرک ہے۔

کرے غیر گر بت کی پوجا تو کافر
جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
جھکے آگ پر بہر سجدہ تو کافر
کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر
مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جسکی چاہیں

محبت میں غلو، افراط و تفریط کا شکار احترام ہمارے لئے اُمت مسلمہ کے لئے ستم قاتل ہیں.....اس کا علاج نہ ہوا تو ہماری بحیثیتِ مسلمان داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں .....کیا کبھی مومن و مشرک برابر ہو سکتے ہیں؟ حضور ﷺ کی امت کے ایک فرد کی حیثیت سے اور خانوادۂ رسولؐ کے ساتھ محبت کرنے، ان کے عاشق ہونے کا ثبوت صرف اسی صورت میں قابل قبول ہوسکتا ہے جب اسوہ رسولؐ اور ان کے نقشِ قدم پہ چلنے والوں کی سیرت کو مشعل راہ بنائیں۔

جنت میں داخل ہونے کی اور جنت کے اماموں کے ساتھ رہنے کی تمنا ہے تو پھر حضرت علیؓ جیسا سچا اور پختہ ایمان چاہیے کہ جب کوئی ساتھ نہ دے رہا تھا تو اس بچے نے اقرارِ حق کیا اور شہادت حق میں اپنی آخری سانس تک کھپا دی.....

خواتین جنت کی امام، سربراہ اور سردار کے ساتھ رہنا دل کو بے تاب رکھتا ہے تو اسوۂ بتولؓ کو اپنایا جائے۔ اپنے بیٹوں کو حسنؓ و حسینؓ کی سیرت میں ڈھالنے کا عزم کیا جائے۔

نوجوانو! اللہ کے نبیؐ، اللہ تعالیٰ کے محبوب حضرت محمد ﷺ کے ''پھولوں'' جنت کے نوجوانوں کے سردار وں کی معیت چاہئے تو حق کا بول بالا کرنے کو مقصد زندگی بناؤ۔ حق کی خاطر جان قربان کرنے کو حقیقی زندگی جانو۔ امت اور ملک و قوم کی خدمت کے دعوے دارو! حکومت کے ایوانوں میں حق کی آواز بلند کرنا سیکھو ..... مفاد پرست حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنا مدعا بیان کرنے کا عزم کرو..... تاریخ سے سبق سیکھو، حق کا بول بالا اور باطل کا منہ کالا ہی ہوتا ہے.....مگر اس کے لئے علیؓ کی شجاعت، فاطمہؓ کی سی پیروئ رسولؐ، حسنؓ کی سی حکمت و جذبہ خیر خواہی، حسینؓ کی سی دلیری اور اصولوں پہ ڈٹ جانے کا حوصلہ چاہیے۔ اس لئے کہ آزمائش کے بغیر کوئی سند قبولیت نہیں ملتی ..... کامیابی آزمائشوں کی بھٹی سے گزر کر کندن ہو جانے کا نام ہے..... کوئی ہے جو خود کو کندن بنانے کے لئے آمادہ ہو؟

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

☆☆☆

ساحل سمندر پر دہشت گردی

روس کے زیر قبضہ مسلم ریاستوں میں

اسلامی اقدار کا احیاء

ذیل میں نیوز ویک 14 اکتوبر 2011ء کے ایک مضمون کا ترجمہ دیا جا رہا ہے۔مصنفہ نے یہ مضمون اپنے نقطۂ نظر سے، اسلام کو بدنام کرنے کی غرض سے لکھا ہے اور سارا زور اس بات پر ہے کہ مسلمان دہشت گردوں کا ایک گروہ مسلم معاشروں میں اسلام کے سخت گیر قوانین کو زبردستی نافذ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔اس میں شک نہیں کہ مسلم معاشروں میں اسلامی اقدار سے منحرف مردوں اور عورتوں کی خاص تعداد موجود ہے۔ان میں وہاں کے اشرافیہ کا طبقہ خاص طور سے شامل ہے جن کی تربیت ہی خالصتاً غیر اسلامی ماحول میں ہوئی ہے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہر جگہ ایسی تحریکیں بھی وجود میں آ رہی ہیں جو مسلمانوں کو اپنے دین کی طرف لوٹ آنے اور اللہ کی بندگی اختیار کرنے کی دعوت دے رہی ہیں۔ان کی تبلیغ کے زیر اثر بہت بڑی تعداد میں مسلمان اسلامی اقدار کی طرف واپس آ رہے ہیں۔جن مسلم ریاستوں نے 1990ء کے بعد روس سے آزادی حاصل کی ہے اگرچہ وہاں سخت بے دین طبقہ حکمران ہے لیکن اس کے باوجود وہاں مسجدیں آباد ہو رہی ہیں۔ہزاروں کی تعداد میں نئی مسجدیں بن رہی ہیں۔زیر نظر مضمون میں ایسی دو ریاستوں (داغستان اور چیچنیا) کا ذکر ہے جو ابھی تک روس کے زیر تسلط ہیں، اور جہاں اسلامی اقدار کی طرف پلٹنے کا عمل جاری ہے۔
مصنفہ نے اس عمل کو اسلامی دہشت گردوں کے خوف کی وجہ سے ایک جبری عمل قرار دیا ہے حالانکہ یہ اس طویل جبر کا ردعمل ہے جو گزشتہ صدی میں کمیونسٹ نظام میں مسلمانوں کو ان کے مذہب سے دور کرنے کے لئے ان پر ڈالا گیا، مصنفہ خود اس بات کا اعتراف کرتی ہے کہ تبدیلی بہت تیزی سے آئی ہے اور اصلی اور بنیادی ہے۔(مدیرہ)

ساحل سمندر پر آج کل مردوں کا رش ہوتا ہے۔ یہ مضبوط جسم کے طاقتور داغستانی مرد ہیں جو داغستان کے دارالخلافہ مخاش کلا میں بحیرہ کیسپین کے ساحل پر ورزش کرتے اور مارشل آرٹس (جُوڈو کراٹے) کی تربیت حاصل کرتے نظر آتے ہیں۔ کچھ لوگ ادھر اُدھر بیٹھے مکھن اور نمک لگے اُبلے ہوئے مکئی کے بھٹوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یا اپنے دوستوں کے کندھوں پر سوار ہو کر سمندر کی لہروں کا لطف اُٹھاتے ہیں اور ایک دوسرے کے مقابلے میں اپنی جسمانی طاقت کا امتحان لیتے ہیں کہ کون زیادہ دیر تک پانی میں رہ سکتا ہے۔

ساحل پر کہیں کہیں شرمیلی خواتین کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بھی نظر آتیں ہیں جو سر سے پاؤں تک فلالین کے لباس میں ملبوس ہوتی ہیں اور اپنے بچوں کے ہاتھ پکڑے سمندر کے پانی میں داخل ہو جاتی ہیں۔ پانی میں داخل ہوتے ہی ان کے لباس اور رنگ برنگے حجاب سمندر کے نمکین پانی سے شرابور ہو جاتے ہیں۔

اور بیکی نیز (bikinis) یعنی پیرا کی کا مختصر عریاں لباس (انگیا اور جانگیہ) پہنے خواتین اب یہاں تقریباً ناپید ہیں۔

یہ معاشرتی انقلاب بہت تیزی سے آیا ہے اور اصلی اور بنیادی نوعیت کا ہے ۔صرف دو سال پہلے تک عورتوں کی انتہائی قلیل تعداد روس کے بحیرہ کیسپین کے ساحل پر اپنے لمبے ساتر لباس اور سکارف پہن کر تیرنے کے لئے آتی تھی ۔ اس سال ، اس خطہ زمین میں جہاں روس میں سب سے زیادہ دہشت گردی ہوتی ہے، رائے عامہ نے یہ فیصلہ کیا کہ عورتوں کے جسموں کی بے حیائی پر مشتمل نمائش کو بند کر دیا جائے ۔کبھی کبھار اگر کوئی سیاح عورت جدید پیراکی کے لباس میں نظر آجاتی ہے تو اس کو دیکھ کر لوگوں کے ماتھوں پر بل پڑ جاتے ہیں اور مقامی زبان میں تلخ جملے سننے کو ملتے ہیں ۔ایک لفظ ''حرام'' ہمیشہ سننے میں آتا ہے جس کا مطلب ہے ممنوعہ کام۔

ان خواتین کی سہولت کے لئے جو سمندر میں تیرنا بھی چاہتی ہیں لیکن وہ اس کے لئے لمبا ساتر لباس (Burkinis) پہنا پسند نہیں کرتیں ،اور اسی طرح ان مردوں کی خواہش کے مطابق جو اسلام کی تعلیمات کی خلاف ورزی سے بچنا چاہتے ہیں ، اسی ماہ داغستان کی حکومت نے ،شرعی پابندیوں کے مطابق روس کی پہلی بیچ (Beach) کا افتتاح کیا ہے جسے ''خواتین کی کوہستانی بیچ'' کہا جاتا ہے ۔ یہ ایک باپردہ علاقہ ہے جس میں داخل ہونے کیلئے ایک دروازہ لگا ہوا ہے ۔اس میں صرف عورتوں ،لڑکیوں اور چھ سال سے کم عمر لڑکوں کو داخل ہونے کی اجازت ہے ۔ یہاں آنیوالی خواتین آرام دہ ،لکڑی کی بنی ہوئی سایہ دار جگہوں میں دھوپ سے بچنے کے لئے آرام کرسکتی ہیں ، یا پھر لمبے ساتر لباس پہنے بغیر مختصر لباس میں پانی میں تیرنے کا لطف حاصل کرسکتی ہیں ۔ اگر کسی کو روس میں اسلام کے عروج کا ثبوت درکار ہو تو اس بیچ کا قیام اس کے لئے کافی ثبوت ہے ۔ یہ خواتین کو بم حملوں سے بچانے کا ایک حفاظتی اقدام بھی ہے کیوں کہ گزشتہ دنوں کیسپین کے ساحل پر ایسے بہت سے دھماکے کئے گئے تھے۔

گزشتہ جولائی میں ایک صبح جب موسم صاف تھا ، چھ بجے کے قریب سکول ٹیچر ییلینا عبدالحلیم اپنی ساتھیوں کے ساتھ مرکزی شہر کے ساحل سمندر پر والی بال کھیلنے کے لئے آئی ۔لڑکیوں نے جیسے ہی پیراکی کے لباس پہنے ، والی بال کورٹ کے بالکل قریب کچھ کم عمر لڑکوں نے بھی اپنی صبح کی کلاس سے پہلے ورزش اور کشتی کی مشق شروع کر دی ۔ ان بچوں کے سوا جو وہاں موجود تھے پورا ساحل سمندر اس وقت خالی نظر آتا تھا ییلینا اپنی دوستوں کے ساتھ والی بال کورٹ میں داخل ہوئی اور بال پھینکنے کیلئے اس نے اپنا قدم آگے بڑھایا ۔اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا اور ییلینا زمین سے دس فٹ اوپر ہوا میں اچھلی اس کا پاؤں ریت میں چھپی ہوئی ایک بارودی سرنگ (Mine) پر جا پڑا تھا ۔اس موسم کا پبلک بیچ پر یہ تیسرا دھماکہ تھا جس کے نتیجے میں ییلینا گھٹنے کسے اوپر تک اپنی ٹانگ سے محروم ہوگئی ۔ وہ کہتی ہے کہ یہ بم ان عورتوں کو سزا دینے کیلئے رکھا گیا تھا جو پیراکی کا لباس پہن کر ساحل پر آتی تھیں ۔اب وہ یہ بھی کہتی ہے کہ کاش یہ اسلامی بیچ اس وقت بن چکی ہوتی ۔''اگر خاص عورتوں کیلئے بنائی گئی یہ محفوظ بیچ ایک سال پہلے بنی ہوتی تو میری ٹانگ آج بھی

موجود ہوتی ''اس نے کہا کہ یہ بھی خوش قسمتی تھی کہ اس کے پاؤں رکھنے سے پہلے کسی بچے نے اس پر پاؤں نہ رکھ دیا۔

شرعی بیچ کے بارے میں سبھی عورتوں کا ردعمل ایسا مثبت نہیں ہے۔ان کا کہنا ہے کہ پہلے یہ لوگ ہمیں بیکینی پہننے پر سخت دھمکیاں دے رہے ہیں۔ پھر یہ ہمیں نیکر اور جینز سے منع کریں گے۔ اور پھر ریستورانوں اور یونیورسٹیوں میں جانے سے روک دیں گے۔ ایسے ہی خیالات کا اظہار داغستان کی ایک فنانشل کمپنی کی منیجر بکا نائی حسین نے کیا ہے۔اس کو خدشہ ہے کہ بڑھتے ہوئے دہشت گرد حملے بالآخر سخت دباؤ کا باعث بنیں گے اور یہ لوگ عورتوں کی زندگی کے ہر شعبے، معاشرتی، خاندانی، روحانی کو اپنی مرضی کے مطابق کنٹرول کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ حملے نا صرف بیکینی پہننے والی عورتوں کے خلاف ہو رہے ہیں بلکہ داغستان کی سکیولر سوسائٹی کی تمام علامات ان کا نشانہ ہیں۔صرف اس سال دوسو سے زائد حملے کھانے کے سٹوروں، کیفے، بھاپ کے حماموں اور شراب بیچنے والی دوکانوں پر ہوئے ہیں۔مذہبی مراکز اور قانون نافذ کرنیوالے ادارے بھی ان سے محفوظ نہیں۔ ان حملوں میں سینکڑوں سماجی کارکن، مقامی ناظمین، پولیس، اعلیٰ افسران یہاں تک کہ امام بھی ہلاک ہو چکے ہیں۔ دوسکولوں کی پرنسپلیں بھی ان حملوں کا شکار ہوئیں جو سکول کی طالبات کے حجاب پہننے کے خلاف آواز بلند کرتی تھیں۔

ان حالات میں جبکہ داغستان میں اسلامی شورش تخویف کے ذریعے عورتوں کو شرعی قوانین کا پابند بنانے کی کوشش کر رہی ہے، ہمسایہ ریاست چیچنیا کے رہنما خود اس سمت میں اقدام کر رہے ہیں۔ وہاں چھوٹی بچیوں کے لئے لازم ہے کہ اپنے سر اچھی طرح ڈھانپ کر سکول آئیں۔گزشتہ خزاں میں اخلاقیات نافذ کرنے والی نیم سرکاری پولیس نے بغیر بازو کے لباس اور اونچی سکرٹ پہننے والی عورتوں کو ڈرایا دھمکایا اور رنگ پھینکنے والی گن سے ان پر رنگ پھینکا۔ اس موسم گرما میں لڑکیوں کے سکولوں میں دو ورقۂ (اشتہار) تقسیم کئے گئے جن پر لکھا تھا۔''ذاتی رویہ بہت اہم ہے۔مسلم عورت کو بلند آواز سے نہیں بولنا چاہیے۔ اور نا ہی کسی مرد کی آنکھوں سے آنکھیں ملانی چاہئیں۔''ان سب اقدام کو ریاست کے اعلیٰ ترین حکمران اور روسی حکومت کے حمایت یافتہ صدر رمضان قادر کی حمایت حاصل ہے۔ رمضان قادر نئے اسلامی لباس کے اصول اپنانے پر زور دیتا ہے اور اس کی بیوی ایک فیشن ہاؤس کی مالک ہے جہاں اسلامی لباس کے معیار طے کئے جاتے ہیں۔ سرکاری ٹیلیوژن پر ایسے پروگرام پیش کئے جاتے ہیں جن میں عورتوں کو اس موضوع پر ہدایات دی جاتی ہیں کہ ایک مسلمان کو کیسا نظر آنا چاہیے۔ ٹی وی پر ایسی ماڈل عورتیں دکھائی جاتی ہیں جو سر سے پاؤں تک لمبی گاؤن میں ملبوس ہوتی ہیں اور ان کے چہرے بھی ڈھانپے ہوئے ہوتے ہیں۔

دوسری کچھ عورتیں ایسی ہیں جو اسلامی لباس پہننے پر اس لئے مجبور ہیں کہ یہ ان کی خاندانی روایت ہے۔ چند دن پہلے ایک سہ پہر میری ملاقات دو نوجوان خواتین، بائیس

سالہ عائشہ اور اس کی بھابھی چوبیس سالہ فاطمہ سے ہوئی انہوں نے با پردہ سیاہ لباس پہن رکھا تھا اور در بند کے علاقے میں اپنے ایک غریب سے گھر میں بوسیدہ قالین پر بیٹھی ہوئی تھیں ۔ یہ لڑکیاں جو اس سے پہلے ، ماسکو اور والگوگراڈ یونیورسٹی کی طالبات تھیں اپنا روسی نام ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھیں ، چند سال پہلے ان کا تعارف دو مسلم سلفی (قدامت پسند) نوجوانوں سے انٹرنیٹ کے ذریعے سے ہوا اور ان سے شادی کر کے وہ داغستان آ گئیں تا کہ وہ اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز کر سکیں ۔

عائشہ نے بتایا کہ اس کا شوہر یہ چاہتا ہے کہ میں اپنا جسم ڈھانپ کر رکھوں اور سیاہ نقاب کے اوپر صرف میری آنکھیں ہی نظر آئیں ۔ میں اب زیادہ باہر نکلنا پسند نہیں کرتی لوگ میری طرف اشارے کرتے ہیں اور مجھے دہشت گرد کہتے ہیں ۔ فاطمہ اور عائشہ کے پاس اپنے شوہروں کا حکم ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ۔ وہ جانتی ہیں کہ اس معاشرہ میں ان کے شوہروں کو عوام الناس کی طرف سے پورا اختیار ہے کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ جو سلوک مناسب سمجھیں کریں ۔

دو سال قبل ماسکو کی انسانی حقوق کی تنظیموں نے چیچنیا میں ایک سڑک پر گولیوں کا نشانہ بننے والی سات عورتوں کی موت سے متعلق سرکاری وضاحت حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہیں ۔ چیچنیا کے صدر رمضان قادر نے صرف یہ کہا کہ ان عورتوں نے بے لگام رویئے کا مظاہرہ کیا تھا اور وہ غالباً خود اپنے ہی خاندانوں کے ہاتھوں غیرت کے نام پر قتل کا شکار ہوئیں ۔ ماسکو کی انسانی حقوق کی تنظیم کی ایک تحقیق کار ٹاٹیانا لوکشینا کا کہنا ہے کہ ہمارے مشاہدے کے مطابق شمالی کاکیشیا میں عورتوں کو توہین آمیز معاشرتی کردار اپنانے پر مجبور کیا جاتا ہے اور عدالتیں عام طور پر گھریلو تشدد کے واقعات پر صرف نظر سے کام لیتی ہیں ۔

گزشتہ مئی میں امریکہ کے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے سترہ لاکھ ڈالر اس مقصد کے لئے مختص کرنے کا ارادہ ظاہر کیا کہ روس میں شمالی کاکیشیا (چیچنیا ، داغستان وغیرہ) میں غیر سرکاری تنظیموں (NGOS) کے منصوبوں کی مدد کی جائے اور اس میں سے نصف رقم اس مقصد کیلئے ہوگی کہ گھریلو تشدد کو ختم کیا جا سکے لیکن اس بات کا امکان نظر نہیں آتا کہ مغرب کا یہ سرمایہ مقامی رویوں کو بدلنے میں کچھ بھی مددگار ثابت ہو گا ۔ اس لئے اس تیزی سے تغیر پذیر خطے میں ماسکو کے حکمران ہی یقیناً اپنی کوششیں جاری رکھیں گے تا کہ عورتوں کی ہر جگہ حفاظت کی جائے ، چاہے وہ ساحل سمندر ہو ، یا بھاپ کے حمام ، یا گلیاں اور بازار ۔

(نیوز ویک 14 اکتوبر 2011ء)

(ترجمہ ۔ مقبول احمد شاہد)

☆☆☆

نعت رسولِ مقبولؐ

طلب شہرت کی ہے مجھ کو نہ اب زر کی تمنا ہے
رسول اللہؐ کے شہر معنبر کی تمنا ہے

سلام آتے ہیں عرشِ پاک سے جس کو فرشتوں کے
مری لوح جبیں کو بس اُسی در کی تمنا ہے

چھلک جائیں سرِ خاکِ مدینہ رُوبرو اُنؐ کے
مری آنکھوں کی حسرت میرے اندر کی تمنا ہے

اُچھل جائے تہوں سے اُن کے قدموں میں چلا جائے
سمندر کے ہر اک پوشیدہ گوہر کی تمنا ہے

یونہی اے اہل مغرب! کیوں بھٹکتے پھر رہے ہو تم
بنا لو راہبر اُن کو جو رہبر کی تمنا ہے

جہادِ دین پیغمبرؐ کی خاطر ہو جدا تن سے
یہی سودائے سر ہے، بس یہی سر کی تمنا ہے

جہاں میں خاتمہ ہو میرا اُن کے نامِ نامی پر
بروزِ حشر مجھ کو جامِ کوثر کی تمنا ہے

مسرت فاطمہ

(انتخاب برگِ طوبیٰ: رفعت اشتیاق)

شہادتِ حسینؓ

انگاروں پہ جب ہونٹ احد بول رہے تھے
کسراؤں کے ایوان و محل ڈول رہے تھے

جاتی ہوئی پت جھڑ کا بدن پیلا پڑا تھا
آتے ہوئے لمحات علَم کھول رہے تھے

مقتل میں شہادت کے مقاماتِ تحیر
جسموں سے جدا سر تھے مگر بول رہے تھے

وہ شعلہ بہ کف ہاتھ کہ ظلمت کے لیے موت
ماحول میں جذبوں کی دھنک گھول رہے تھے

سینوں پہ لگے زخم تھے تیغوں کے، سناں کے
اور ہاتھ صداقت کے گہر رول رہے تھے

کھلتے ہوئے غنچوں کے شفق رنگ مناظر
خوشبو کے جھروکوں کے بھی پٹ کھول رہے تھے

وہ وقت جب اک قوتِ باطل سے ٹھنی تھی
بچے مرے کٹ مرنے کو پر تول رہے تھے

اُمِ عبدِ منیب

سقوطِ ڈھاکہ کے حوالے سے

دسمبر جب بھی آتا ہے...!

دسمبر جب بھی آتا ہے،
درِ جاں پر اداسی لوٹ آتی ہے،
ہمیشہ کے لیے اس سے
بچھڑ جانے کا صدمہ یاد آتا ہے،
خود اپنی ذات کے تقسیم
ہونے کی اذیت یاد آتی ہے،
دلِ آزردہ کے دو نیم ہونے کی کسک
پھر سے سلگتی ہے،
غم واندوہ میں ڈوبے مناظر
آنکھ سے اوجھل نہیں ہوتے،
شکستِ فاش کا منظر
نظر میں کوند جاتا ہے،
یہ دل پھر ڈوب جاتا ہے!
محبت کس طرح دم توڑتی ہے!
ساتھ کیسے چھوٹ جاتا ہے!
اچانک یک بیک کیسے
تعلق ٹوٹ جاتا ہے!!
یکا یک دشمنی کیسے سما جاتی ہے
سینوں میں!
یکا یک سرکشی کیسے
اُبھر آتی ہے جذبوں میں!
یکا یک، ہاتھ سے یہ ہاتھ
کیسے چھوٹ جاتا ہے
دسمبر جب بھی آتا ہے
مجھے پھر دشتِ وحشت میں
ہراساں چھوڑ جاتا ہے!

شمیم فاطمہ

سفر کا آغاز کرتے ہیں

سفر آغاز کرتے ہیں
اجالوں کا، بہاروں کا
محبت کے جزیرے پر
انوکھے مرغزاروں کا
جہاں پر پھول کھلتے ہوں
محبت کے، مروت کے
جہاں پر دیپ جلتے ہوں
نئے امکاں کی راحت کے
کوئی بھی لمحۂ فرصت
سدا روشن ہی رہتا ہو
زمینِ دل یونہی
شاداب اور آباد رہتی ہو.....
نہ ڈھلتی ہو
مسافت آبلہ پائی کی شدت میں
نہ رہتے ہوں.....
نئے منظر بھی، پس منظر کی وحشت میں.....
ہجوم کار کچھ نہ ہو.....
نہ ہو کچھ وحشتِ پیہم
ہوا، خوشبو، روپہلی، چاندنی
اور ریشمیں فرصت
ہمارے گرد پھیلی ہو
سفر آغاز ہم کرتے ہیں
خوابوں کے سہاروں کا
چلو آغاز کرتے ہیں!

صائمہ نورین بخاری

وطن عزیز کی حالتِ زار پر

ہلے جاتے ہیں اوپر کے چوبارے
قضا کھٹکا رہی ہے در ہمارے
جو تھے کل تک مری خوشیوں کے ضامن
وہ کیوں اب بانٹتے ہیں موت سارے
کبھی رہتے تھے سب یک جان ہو کر
نہ تھے ہم کو محبت میں خسارے
یہ کس نے آگ پھینکی ہے وطن میں
کہ جلتے جا رہے ہیں گل بچارے
خدا بن بیٹھے ہیں یہ ناگ کیسے؟
فلک سے توڑتے ہیں جو ستارے
وہ کیسے رہ نما بنتے ہمارے
اگر دیتے نہ ہم ان کو سہارے
انھیں چاہت ہے زر سے اور زمیں سے
انھیں ملتے ہیں شیطاں سے اشارے
بہت احمق ہو پرویںؔ سوچتی ہو
بھنور میں بیٹھ کر ڈھونڈیں کنارے

ڈاکٹر پروین سیف مانسہروی

شبِ تاریک ہے یارو!

اندھیروں کا تسلط ہے
شبِ تاریک ہے یارو
کوئی تارا کوئی جگنو
کرن کوئی امیدوں کی
نہیں چھوتی نگاہوں کو
نہ ٹکراتی سماعت سے
اندھیرا ہی اندھیرا ہے
سجھائی کچھ نہیں دیتا
دکھائی کچھ نہیں دیتا
تو کیا تم نور کی کرنوں کو پیہم سوچ جاؤ گے؟
کوئی شمع جلائے گا نہ تارا توڑ آئے گا.....!
میرے ساتھی! اندھیروں کی فضاؤں میں
گھسٹتی زندگی تو ایک ذلت ہے
اٹھو خونِ جگر سے شمعِ نورانی جلائیں ہم
اندھیروں کے مٹانے کو جوانی آزمائیں ہم
اجالوں کے پیمبر بن کے ظلمت کو مٹا ڈالیں
ہر اک سُو نور پھیلا کر محبت کی بنا ڈالیں

عذرا مریم خان

اک نئی صبح

جب ایئر ہوسٹس نے کراچی پہنچنے کا اعلان کیا تو میں نے سکون کا سانس لیا حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک تھکا دینے والا سفر تھا۔ پہلے میامی سے نیو یارک پھر نیو یارک سے سولہ گھنٹے کی فلائٹ کے ذریعے اسلام آباد اور پھر کراچی، کہنے کو براہِ راست مگر پھر بھی بالواسطہ سفر۔ میں نے سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اپنے اکڑے ہوئے جسم کو سیدھا کرنے کی کوشش کی میں ایک سال پہلے ہی پاکستان آئی تھی ہم جیسے لوگوں کے لئے اس طرح بار بار سات سمندر پار کا سفر کرنا ظاہر ہے مشکل ہوتا ہے پہلے اپنے بھائی کی شادی پر اور اگلے ہی سال اب بظاہر بلا وجہ۔ ائیر پورٹ پر اپنے پیارے بھائی حماد کو دیکھ کر ذرا اطمینان ہوا میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا عائشہ بھابھی نہیں آئیں ایک ہی سال میں اس نے تمہیں کھلا چھوڑ دیا ہے'' اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ گھر پہنچ کر امی کے گلے لگ کر محسوس ہوا کہ جیسے برسوں بعد ملے ہوں۔ ماں پھر ماں ہوتی ہے میں نے گہری سانس لے کر اُنکی خوشبو اپنے اندر اتار لی، عائشہ کہاں ہے؟ ذرا سانس بحال ہوئی تو میں نے پوچھا۔

''تم نہا دھو کر سفر کی تھکن تو اتار لو پھر بات کریں گے'' میں اپنا سامان لیکر کمرے کی طرف چل دی اس وقت تک مجھے حالات کی سنگینی کا احساس ہی نہ تھا۔

تین چار دن تو میں یہی سمجھتی رہی کہ بھابھی والدہ کے گھر آرام کے سلسلے میں گئی ہیں آخر تین چار مہینوں میں ان کے یہاں ننھے مہمان کی آمد متوقع تھی مگر پھر مجھے بے چینی سی ہونے لگی آخر ایسی بھی کیا بے رخی نند بیچاری شادی کرا کے جو گئی تو اب سال بھر بعد آئی تھی اور بھابھی غائب، بھائی جو ویسے بھی کم گو تھا اب بات کرنے کا روادار نہ تھا اور اماں سے کچھ پوچھو تو وہ ٹال دیتی تھیں۔ بالآخر ایک دن میں نے اُن سے پوچھ ہی لیا۔

''امی آپ لوگ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔''

''تم سے چھپا کر کیا کریں گے جب ساری دنیا میں جگ ہنسائی ہو چکی'' امی نے دلگرفتہ لہجے میں کہا۔

''عائشہ چار مہینے سے اپنے والدین کے گھر ہے وہ گھر بسانے والی لڑکی تھی ہی نہیں''

مجھے اچھا خاصا جھٹکا لگا۔ عائشہ کا معصوم سا چہرہ میری نظروں میں گھوم گیا۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے'' میں بڑبڑائی اور امی نے غصے سے مجھے دیکھا۔

''تمہارا مطلب ہے ہم جھوٹ بول رہے ہیں۔''

''نہیں'' میں یکدم گڑبڑا گئی۔ ''میرا یہ مقصد نہیں تھا لیکن وہ ایسی لگتی تو نہ تھی۔'' امی نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ ''اس

کی معصوم صورت سے ہی تو ہم دھوکہ کھا گئے ۔ کیا کیا تماشے نہ کیے اس نے اس گھر میں، عزت دو کوڑی کی کر کے رکھ دی ہماری.....'' کہتے کہتے امی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں تڑپ اٹھی ،نفرت و اشتعال کی ایک لہر سی میرے اندر ابھری جی چاہا کہ جا کر دو کرارے تھپڑ اس بے حس لڑکی کو رسید کروں جس نے میری ماں کو اس حال تک پہنچایا۔

اگلے ہی دن اتفاق سے میری بہت ہی قریبی دوست اور خالہ کی بیٹی کرن مجھ سے ملنے آ گئی ظاہر ہے اتنے عرصے بعد ملنے کی خوشی بھی تھی اور ڈھیروں باتیں بھی جمع تھیں وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا ۔ امی کی بھی بھانجی تھی لہٰذا وہ بھی ساتھ ہی آن بیٹھیں بات چیت کے دوران ہی امی کو عصر کی نماز کا خیال آیا اور وہ اٹھ کر چل دیں ۔ جونہی امی اٹھیں اس نے رازداری سے کہا۔

''تم آنٹی کو سمجھاؤ جو انہوں نے عائشہ کے ساتھ کیا وہ صحیح نہیں ۔''

اور مجھے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا ۔ کرن رکے بغیر بول رہی تھی غالباً وہ امی کے آنے سے پہلے اپنی بات مکمل کر لینا چاہتی تھی ۔

''دیکھو میری بھی بیٹی ہے تمہارے آگے بھی بیٹیاں ہیں ، یوں کسی کی بچی کے ساتھ ظلم کرنا ایسی حالت میں اور پھر گھر سے باہر نکال دینا بھلا کہاں کا انصاف ہے ۔ مان لو اس سے کچھ غلطیاں بھی ہوئی ہوں گی مگر پھر بھی بہر حال وہ کم عمر تھی ۔''

میں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا ۔ ''یقین کرو اس بارے میں میں کچھ زیادہ نہیں جانتی ۔ امی زیادہ بات کرنے کی روادار نہیں بلکہ وہ تو بات شروع ہونے سے پہلے ہی رو پڑتی ہیں ۔ پھر مجھے بھی اتنا اندازہ نہ تھا میری غلطی ہے کہ میں نے یکطرفہ بات سن کر فیصلہ کر لیا۔ بہر حال اگر تم کہتی ہو تو میں ضرور حماد سے اس کے متعلق بات کروں گی ۔''

پچھلا ایک ہفتہ میرے لئے حیرتوں کا تھا ۔ مجھے بیس سال ہو گئے تھے اس گھر سے رخصت ہوئے ۔ شادی ہو کر جب میں امریکہ گئی تو ظاہر ہے وہاں بھی زندگی اتنی آسان نہ تھی ۔ دو نندیں ، ایک جیٹھ، دیگر رشتہ دار اور پھر ساس میرے ساتھ تھیں ہم نے وہاں بھی ایک چھوٹا سا پاکستان بسا لیا تھا۔ لیکن ایک چیز اس پاکستان کی وہاں پر نہ تھی ۔''فراغت'' جی ہاں ، میں سمجھتی ہوں یہ فراغت بہت سے خود ساختہ مسائل بھی پیدا کر دیتی ہے ..... بہر حال ہو سکتا ہے میں بھی وہاں کی مادی زندگی کے تمام ہی شعار اپنا لیتی مگر کچھ اپنے اندر کی کسک اور کچھ اماں جی کے اصرار اور کچھ بڑھتی ہوئی بچیوں کی تربیت کی فکر نے ایسا مجبور کیا کہ میں ریگولر اسلامک سنٹر جانے لگی ۔ اور یوں دین کو بھی بہت قریب سے ، غیر روایتی پیرہن میں دیکھنے کا موقع مل گیا ۔ اسی لئے ہو سکتا ہے آپ کو میری کہانی مختلف لگے مگر یقین کریں میں نے ہر جگہ کوشش کی ہے کہ میں حقیقت سے بعید بات نہ کروں ۔

اسی حقیقت کی تلاش نے بالآخر مجھے حماد سے بات کرنے پر مجبور کر دیا ۔ دو اتنی مختلف کہانیاں ایک ہی واقعے کے متعلق ، کرن دراصل میری دوست ہونے کے علاوہ عائشہ کی پڑوسن بھی تھی اور کچھ عورت ہونے کے ناطے فطری طور پر

اس کی ہمدردی عائشہ کے ساتھ تھی۔لیکن میں نے فیصلہ کرلیا تھااس طرح یک طرفہ طور پرکوئی رائے ہرگز نہ قائم کروں گی ۔

دن میں تو کوئی اس طرح کا موقع ملتا نہ تھا، رات میں میں نے حماد کو جالیا۔ وہ حسبِ معمول کمپیوٹر پر مصروف تھا۔ تھکن اور پریشانی اس کے چہرے پر مترشح تھی مجھے بے اختیار اپنے بھائی پر پیار آ گیا اور اس لڑکی کی نا قدری پر حیرت ہوئی جو اتنے پیارے انسان کو چھوڑ گئی پھر میں نے خود ہی اپنے آپ کو سرزنش کی ۔کوئی عورت خوامخواہ اپنی جنت نہیں اجاڑتی، کچھ تو ہے جو میں جان نہیں پائی۔

''حماد''، میں نے اُسے متوجہ کیا،''تھوڑا سا وقت ہوگا تمہارے پاس۔'' میں نے اُسے کمپیوٹر میں مصروف دیکھ کر کہا۔

''جی بالکل آپا۔''اس نے سعادتمندی سے کمپیوٹر آف کیا اور میری طرف متوجہ ہوگیا۔

میں نے کہا''میں جب سے آئی ہوں، مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی کہ یہاں کیا ہورہا ہے؟ امی کچھ کہتی ہیں، پڑوسی، رشتہ دار کچھ لیکن مجھے تم سے امید ہے کہ تم مجھے بالکل صحیح بات بتاؤ گے۔''

''کیا بتاؤں آپا؟''اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا ۔''بس یوں سمجھیں میرا نصیب ہی نہ تھا۔''

میں نے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا''لیکن میرے چندا! یہ کوئی اتنا آسان بھی نہیں کہہ دینا کہ نصیب ہی نہ تھا۔ آخر ایسا کیا مسئلہ ہوگیا؟ چھوٹی موٹی کھٹ پٹ کس گھر میں نہیں ہوتی؟''

''بس آپا آپ یوں سمجھ لیں اُسے دلچسپی ہی نہ تھی''اس نے ٹالتے ہوئے کہا۔میں نے سخت لہجہ اپناتے ہوئے کہا۔'' یہ بات اس نے تم سے خود کہی یا تم نے کسی سے سنی'' وہ گڑبڑا گیا کہنے لگا،''نہیں آپا اس کے رویوں سے ایسا محسوس ہوتا تھا، وہ گھر میں دلچسپی ہی نہ لیتی تھی۔'' میں نے تلخ ہوکر کہا ،''مجھے تو محسوس ہورہا ہے تمہاری بھی کوئی خاص دلچسپی اس میں نہیں کیا میں یہ قیاس آرائی کرلوں کہ تمہارا بھی کہیں اور انٹرسٹ تھا۔''اس نے میرے تلخ لہجے کو محسوس کرتے ہوئے کہا،

''افوہ آپا آپ یہ کیسے بات کررہی ہیں جیسے آپ میری نہیں عائشہ کی بہن ہوں۔''

''حقیقت تو یہی ہے کہ اب میں تم دونوں کی بڑی ہوں اور اس معاملے میں جو آدمی تمہارے سامنے تمہاری تعریف کرے، عائشہ کی برائیاں کرے، سرد پڑتی ہوئی آگ کو اور بھڑکانے کی کوشش کرے اسے کبھی خیر خواہ مت سمجھنا کیونکہ ایسا شیطانی کام کرنے والا کبھی کسی کا دوست نہیں ہوسکتا۔''

''مگر آپا ایک پھوہڑ، بدسلیقہ، بدزبان لڑکی اپنا گھر نہیں بسانا چاہتی اس میں شیطان بیچارے کا کیا قصور؟''اس نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ مجھے محسوس ہوا وہ معاملے کو بہت ہی غیر اہم سمجھ رہا ہے۔

میں نے تاسف سے کہا،''تمہیں مذاق کی سوجھ رہی ہے، کیا تمہیں معاملے کی نزاکت کا ذرا سا بھی احساس نہیں؟ ''

''یہ بات نہیں آپا، بس مجھے یقین ہے اُسے تھوڑے ہی دنوں میں خود ہی عقل آ جائے گی۔''

''تو کیا یہ اس کی سزا ہے'' میں نے پوچھا۔

''یہی سمجھ لیں۔'' اس نے جواب دیا۔''فردِ جرم کیا ہے؟'' میں نے کہا۔

''یہ کیا بات ہوئی'' اس نے مجھے استفہامیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔''

''جب عدالت کسی مجرم کو کسی جرم کی سزا سناتی ہے تو پہلے فردِ جرم عائد کرتی ہے، پھر جرم اگر ثابت ہو جائے تو سزا سناتی ہے۔'' میں نے اپنے کہے کی تشریح کی۔

''مگر آپا یہ کوئی عدالت تو نہیں'' اس نے اکتا کر کہا۔

''تم نے وہ حدیث نہیں پڑھی کہ تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے متعلق سوال کیا جائیگا۔'' مجھے اس کے رویے پر افسوس ہو رہا تھا۔''جس رعیت کی آپ بات کر رہی ہیں وہ تو مالک سے کم اختیارات پر راضی ہی نہ تھی۔''

''میرا خیال ہے تم اس رشتے کی نزاکت کو محسوس ہی نہیں کر سکے۔'' میں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔''جب ایک مرد اور عورت نکاح کے بندھن میں بندھتے ہیں تو انکا تعلق غلام آقا، مالک نوکر کا سا نہیں ہوتا۔ مرد ایک شریف، خاندانی عورت کو نکاح کے بندھن میں باندھتا ہے اور مہر کے نام پر ایک باعزت رقم اس کے ہاتھ میں رکھتا ہے جو ایک طرح سے اس بات کا ثبوت ہوتی ہے کہ وہ اسی طرح اب عمر بھر عورت کے اخراجات پورے کرے گا اور عورت اس کے مال اور اس کی عزت کی حفاظت کرے گی۔ کیا تمہیں ان دو اہم ترین معاملات میں اُس سے شکایت تھی؟'' میں نے سوال کیا۔

''نہیں'' اس نے فوراً کہا پھر میرے سوال کے پیچھے چھپے مقصد کو بھانپ کر کہا،

''یہ کیسی باتیں کر رہیں ہیں آپ؟ امریکہ میں ایسا ہوتا ہوگا ہمارے یہاں تو عورت کو مرد کی مرضی کے مطابق چلنا پڑتا ہے۔''

''خیر ایسا بھی اندھیر نہیں'' مجھے اس کی ناسمجھی پر افسوس ہوا۔''اول تو امریکہ وغیرہ میں بھی ایسا نہیں ہوتا عورتوں کے حقوق کے نام پر انہوں نے ایسے ایسے قوانین بنائے کہ وہ خود عورتوں کے لئے عذاب بن گئے مثلاً طلاق کے بعد عورت مرد کی آدھی جائیداد کی مالک ہوگی ایسے قوانین کا نتیجہ یہ نکلا کہ مردوں نے شادیاں ہی کرنی چھوڑ دیں، شادی کریں گے، نہ بنی اور عموماً وہاں کے آزاد خیال افراد کی کم ہی بنتی ہے اور نتیجتاً طلاق دی تو جائیداد دینی پڑے گی۔ تو بہتر ہے شادی ہی نہ کرو۔ پانچ، دس سال لوگ بغیر شادی کے ساتھ رہتے ہیں۔

یہ تو ایک انتہا ہے دوسری ہمارے یہاں ہے۔ عورتوں کی کمزوری معاشرتی دباؤ اور تعداد کی زیادتی کا یہ فائدہ اٹھایا کہ انہیں ان کے جائز حق سے بھی محروم کر دیا۔ جو میں تمہیں بتا رہی ہوں وہ اصل دین ہے توازن کی راہ۔ ایک اچھی، خاندانی خوبصورت، تعلیم یافتہ عورت کو قیدِ نکاح میں لانے کے لئے مرد ایک مناسب اپنی حیثیت کے مطابق حق مہر دے اس سے عورت کی حیثیت اور مقام بلند ہوتا ہے۔''

''جی ہاں ! اتنا بلند ہوتا ہے کہ وہ میاں کے بھی سر پر چڑھ کر ناچنے لگتی ہیں ۔ ڈکٹیٹ کرنے لگتی ہیں کہ یوں کرو یوں نہ کرو۔'' حماد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ میں ایک لمحے کے لئے سوچ میں پڑ گئی ۔ بظاہر عائشہ میں مجھے ایسی کوئی چیز نظر نہ آئی تھی وہ سلجھی ہوئی تعلیم یافتہ لڑکی تھی شادی طے ہونے سے دو ہفتے قبل میں پاکستان آئی تھی ظاہر ہے اتنا وقت تو تھا نہیں البتہ ایک چیز پر میں نے اعتراض کیا تھا وہ خاصی کم عمر تھی تقریباً انیس سال بی اے کا امتحان دیا تھا اور حماد ماشاء اللہ برسرِ روزگار تھا چھبیس سال کا، مزاجاً بھی سنجیدہ جبکہ وہ شوخ و چنچل تھی مگر امی نے میرے اعتراض کو قابلِ اعتناء نہ جانا بلکہ الٹا بگڑنے لگیں کہ ہم تو بیاہ کر آئے تو اس سے بھی کم عمر تھے اور عمروں کا فرق اس سے بھی زیادہ تھا اور میں قائل بھی ہوگئی تھی بلکہ بقول امی کے کم عمر لڑکی جلدی اور آسانی سے سسرال کے ماحول میں ڈھل جاتی ہے مگر یہاں تو حال یہ ہوا کہ الٹا لینے کے دینے پڑ گئے ۔ حماد کو میں نے اس کے حال پر چھوڑ دیا سوچا امی سے کھل کر بات کروں گی ۔

اگلے ہی دن صبح ناشتے کے بعد جب امی ذرینہ کو دوپہر کے کھانے کی ہدایت دے رہی تھیں میں نے انہیں جا لیا۔ سوچا تھا آج تو ضرور اطمینان سے بات کروں گی مگر امی ذرینہ سے فارغ ہوتیں تب ۔ دونوں مسلسل بحث میں الجھی ہوئی تھیں ۔ مسئلہ یہ تھا کہ امی چاہتی تھیں بریانی پکے دوپہر کے لئے اورات میں کوئی سالن زرینہ بیگم کا اصرار تھا کہ اُسے جلدی گھر جانا ہے لہٰذا ایک ہی سالن پکا لیا جائے تاکہ دوپہر اور رات دونوں میں گذارا ہو جائے ۔

وہ تلخ لہجے میں بولی، ''ہمارا ابھی پیچھے گھر ہے، بچے ہیں ، باجی کچھ تو خیال کرو'' ۔ امی نے مزید غصے سے کہا، ''ابھی پچھلے ہفتے تو نے ایک چھٹی کی ، ایک دن جلدی چلی گئی آدھا کام کر کے اور آج پھر بچہ بیمار ہے، پہلے کپڑے دھونے تھے اس سے پہلے کسی کی فوتگی ہوگئی آخر میں کب تک تیرے بہانے سنوں ۔''

''تو نہ سنو جی'' اس نے اور تلخ ہو کر کہا ۔ ''آپ کوئی اور کام والی دیکھ لو میں نہیں آؤں گی کل سے ۔'' اس کے تیور دیکھ کر امی تھوڑا ٹھنڈا ہوئیں کہنے لگیں ۔ ''جو تیری مرضی ہو کر لے بھئی ایسا بھی کیا مزاج ، اس کو تو ایک سے دوسری بات بولو تو بری لگ جاتی ہے ۔''

ذرینہ کے مسلسل برتن پٹخنے کی آوازیں بیک گراؤنڈ میوزک کے طور پر آ رہی تھیں ساتھ میں بآواز بلند سوچا جا رہا تھا ۔

''کسی کو احساس نہیں ہم بھی انسان ہیں بال بچے دار ہمارے بھی پیچھے سو جھنجھٹ لگے ہوتے ہیں آخر غریب کہاں جائے .....''

امی نے میرا ہاتھ پکڑا اور وہاں سے ہٹ گئیں ، ''چلو ہٹو یہاں سے ، اس کی باتیں سنتی رہی تو میرا بلڈ پریشر ہائی ہو جائے گا ۔''

امی کے کمرے میں تھوڑا سکون تھا اسی لئے میں نے بات چھیڑی ۔

''وہ امی عائشہ کے بارے میں کیا سوچا آپ نے ؟''

یہ سننا تھا کہ امی کو گویا کرنٹ لگ گیا، ''اب کاہے کا ذکر ؟''

انہوں نے تلخ ہوکر کہا، ''پڑا رہنے دو اس کو ماں باپ کے گھر، چار دن بٹھا کر کھلائیں گے تو خود ہی عقل ٹھکانے آ جائے گی ۔''

''مگر امی یہ صرف عائشہ کی زندگی کا مسئلہ نہیں آپ کے پیارے بیٹے حماد کی زندگی بھی تو اس سے جڑی ہوئی ہے ۔ آپ دیکھتی نہیں کیسی ویرانی آ گئی ہے اس کے چہرے پر۔'' میں نے امی کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ الٹا مجھے سمجھانے بیٹھ گئیں ۔

''یہ تو کچھ نہیں بیٹا، ابھی تو اس کے منہ پر تھوڑا پانی آیا ہے، ایک دن اس ڈائن نے میرے بیٹے کو خوش نہ رکھا، مرجھا کر رہ گیا تھا جب سے وہ گئی ہے میرے بچے کے منہ پر رونق آ گئی ہے۔''

''لیکن امی، اس طرح زندگی تو نہیں گذر سکتی ۔'' میں نے کہا۔

''میں بھی یہیں کہتی ہوں حماد کو، تین حرف بھیجے ایسی عورت پر، میں اس کے لئے اب کی مرتبہ دیکھ بھال کر عائشہ سے بھی اچھی لڑکی لاؤں گی ۔'' امی اس وقت بالکل روایتی ساس نظر آ رہی تھیں ۔

''امی'' میں نے بہت پیار سے انہیں مخاطب کیا، ''اگر ایسا ہی مسئلہ میرے ساتھ ہوتا ۔'' آپ کی بیٹی کے ساتھ'' تو کیا آپ مجھے بھی یہی مشورہ دیتیں ۔ ماں تو آپ ہم دونوں ہی کی ہیں پھر بیٹی اور بیٹے کے معاملے میں یہ دوہرے معیار کیوں؟ بیٹی کا گھر بسانا، آباد ہونا جتنا ضروری ہے اتنا ہی بیٹے کا بھی ہوتا ہے اور پھر چھوٹے موٹے اختلافات کس گھر میں نہیں ہوتے ان کو بنیاد بنا کر گھر تو نہیں توڑے جاتے ۔ شروع میں سب کو سیٹ ہونے میں تھوڑا ٹائم لگتا ہے ۔'' میں نے کہا۔

''ربیعہ'' امی نے قدرے جھنجھلا کر کہا، گویا میری کم عقلی کا ماتم کر رہی ہوں ۔'' تم کہاں خود کو اس سے ملانے لگیں، تم نے تو کتنی سمجھداری سے، رکھ رکھاؤ سے پورے سسرال کو اپنی مٹھی میں کر لیا ایک وہ چھٹانک بھر کی چھوکری مجھے، میرے اختیارات کو چیلنج کر رہی تھی ۔ سارے گھر میں بلا شرکت غیرے حکمرانی چاہیے تھی اُسے، ساس کا وجود آنکھوں میں کھٹکتا تھا، دو گھڑی حماد میرے پاس بیٹھ جائے تو منہ سوج جاتا تھا، اور ایک سے دوسری بات کہہ دو تو مزاج نہیں ملتے تھے محترمہ کے،'' امی کی دہائی جاری تھی میں نے ٹھنڈی آہ بھر کر سوچا بالآخر آ گئی بلی تھیلے سے باہر، وہی ساس بہو کی روایتی چپقلش! میں خاموشی سے امی کے شکوے شکایات سنتی رہی ۔

''کھانا بالکل بدمزہ پکاتی تھی، دل ہی نہ لگتا تھا اس کا کسی کام میں''..... میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا، ''ذرینہ تو تھی پھر آپ کو ضرورت ہی کیا تھی اس سے کھانا پکوانے کی ۔''

''ہائیں'' امی میری بات سن کر سر سے پاؤں تک ہل گئیں ۔'' ذرینہ کو تو میں نے اس کے جانے کے بعد رکھا ہے، بھلا بہو گھر میں لانے کے بعد میں نوکروں سے کھانا پکواتی اور ذرینہ کے ہاتھ کا کھانے سے تو بہتر ہے آدمی بھوکا مر جائے بس یہ تو مجبوری ہے اب اس عمر میں میری صحت اجازت نہیں دیتی ۔''

امی پھر اپنی کچھ حقیقی کچھ خود ساختہ بیماریوں پر موضوع پلٹ کر لے آئیں مگر اس سے پہلے کہ ہم بہت دور نکل جاتے میں نے چابکدستی سے موضوع کو پھر عائشہ پر پلٹ دیا۔

''مطلب یہ کہ عائشہ بہر حال ذرینہ سے بہتر پکاتی تھی ۔''میں نے امی کی بات کا لب لباب پیش کیا۔

امی ایک لمحے کے لئے خاموش ہوگئیں پھر کہاں،''ہاں '' پھر یکدم ہڑ بڑا گئیں کہ ہائیں یہ تو منہ سے بہو کی تعریف نکل گئی اس لئے اگلے ہی لمحے بیان بدل دیا،''بس غنیمت تھا، سمجھو گذارا ہو جاتا تھا۔''

''ذرینہ کو آپ کتنے پیسے دیتی ہیں؟'' میں نے ایک اور سوال کیا۔ امی نے جواب دینے سے پہلے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا گویا سوال کی غرض و غایت جاننا چاہ رہی ہوں میں نے کندھے اچکا کر کہا،''بس ایسے ہی معلومات کے لئے ''

''چھتیس سو روپے''امی نے کہا۔

''اس پر یہ مہینے کی چار چھٹیاں لیتی ہے، اپنی من مانی کرتی، آگے سے جواب دیتی ہے وہ بھی اتنی بدتمیزی سے، پیسے الگ لیتی ہے اس کو آپ برداشت کیے جا رہی ہیں بہو کو برداشت نہ کر لیا آپ نے بہر حال وہ سستی پڑ رہی تھی آپ کو ۔''

بس اتنا سننا تھا کہ امی بھڑک اٹھیں،''غضب خدا کا یہ تم اپنی ماں کو باتیں سنا رہی ہو، اور وہ بھی اس چھٹا نک بھر کی چھوکری کے حق میں جسے تم صحیح طور پر جانتی تک نہیں۔ شاباس ہے بیٹا خوب تم نے ماں کی ریاضتوں کا پھل دیا، دو کوڑی کی اوقات کر کے رکھ دی۔''اس سے آگے امی سے کچھ کہا نہ گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں اور میں بری طرح نادم ہو گئی میں نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا،''خدا کی قسم! اماں میرا مقصد صرف آپ کو سمجھانا تھا۔''اور پھر دوڑ کر گئی انکے لئے پانی لیکر آئی۔ تھوڑی دیر میں مجھے اندازہ ہوا انکا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا ہے تو میں نے بات کرنے کی کوشش کی مگر جواب ندارد میں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا،''امی مجھ سے بات بھلے نہ کریں مگر میری بات سنئے گا ضرور، جب بہو کی اوقات آپ کی نظر میں کام والیوں سے بھی گھٹ جائے تو ایک لمحے کے لئے رک کر سوچئے کہ بہو کے روپ میں جو عورت آپ کے گھر میں آئی ہے وہ آپ کی پوری نسل کی امین ہوتی ہے اور آنے والا وقت چاہے آپ کتنا ہی روک لیں ، پابندیاں لگا لیں بہر حال اسی کا ہوتا ہے''

یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے آپ پتھروں سے سر پھوڑ رہے ہوں ۔ جو معاشرہ اللہ سے دور ہو جائے وہ ایسا ہی افراط و تفریط کا شکار ہو جاتا ہے جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون چلنے لگتا ہے یوں سمجھیں ہم ایک جنگل میں رہ رہے ہیں ۔'' میں اور آپ'' جی ہاں دوسرے کی بات چھوڑ دیں اپنی بات کریں ہم میں سے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اسے کوئی فرض ادا نہ کرنا پڑے اور پورے پورے حقوق حاصل ہو جائیں ۔لیکن ہمارے دلوں میں اگر ذرہ بھر بھی ایمان ہو اور اس بات کا یقین کہ ایک دن قیامت برپا ہونے والی ہے جہاں آدمی کو رائی برابر بھی کی ہوئی زیادتی کا جواب دینا پڑے گا تو ہم ایسے بے حس اور سنگدل نہ بنیں اور آخرت کو چھوڑیں اگر دنیا

میں یہ احساس ہو کہ کتنی بہنیں بھائیوں سے تمامتر محبت کے باوجود محض حسد، جلن، وقتی فائدوں کے لئے اپنے پیاروں کو کتنی اذیت دیتی ہیں اور گھر اجاڑنے جیسے شیطانی فعل میں شیطان کی پوری پوری مددگار رہوتی ہیں۔ یقین کریں کہ اگر ہم عورتوں میں احساس جاگ جائے تو ہمارا پورا معاشرہ اس ٹوٹ پھوٹ سے بچ جائے جو اس کے اندر برپا ہے ہمارے تقریباً سارے مسائل حل ہو جائیں۔ بہرحال پتھروں سے سہی میں نے سر پھوڑنا نہ چھوڑا مایوسی تو ویسے بھی کفر ہے۔ اس دن خالہ خدیجہ آئی ہوئیں تھیں محلے داری بھی تھی اور امی سے دیرینہ دوستی بھی اس لئے اکثر چکر لگاتی رہتی تھیں۔ میں اتنا دھیان نہ دیتی اگر چلتے پھرتے کچھ الفاظ میرے کانوں میں نہ پڑ جاتے بس خالہ کی ایک دو باتیں سن کر میں نے وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ خالہ تمام جھگڑے کے کوائف سے واقف بلکہ مجھ سے زیادہ واقف لگ رہی تھیں مجھے بیٹھے دیکھ کر انہیں اور تقویت ملی اور انہوں نے غالباً سوچا فرصت سے عائشہ کا کچا چٹھا بیان کریں مگر میں نے ان سے کہا، ''چھوڑیں خالہ! کیا فائدہ غیبت کرنے کا، آگے کیا کرنا ہے یہ سوچیں۔''

''آئے ہائے!'' وہ اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوئیں ''غیبت کہاں کی! جو سچ ہے وہ میں کہہ رہی ہوں۔ ایسی بد مزاج لڑکی، آئے گئے تک کو گھاس نہ ڈالتی، چائے شربت بھی پوچھتی تو ایسا منہ بنا کر گویا کونین نگل رہی ہو یہ تو تمہاری ماں ہے جس نے اتنے دن بھی برداشت کر لیا کوئی اور ہوتی تو ایک دن بھی کھڑا نہ رکھتی۔''

امی اور تن گئیں، یہ ہے المیہ ہمارے معاشرے کا، کہیں آگ لگی دیکھو، اور پٹرول لیکر پہنچ جاؤ اور بھڑکاؤ، سلگاؤ پھر تماشا دیکھو۔ تماش بینوں کو یہ انداہ ہی نہیں ہوتا کہ کب یہ آگ خود ان کے گھروں کو بھی پہنچ جائے گی اور یوں معاشرے کے ہر گھر میں کہیں شعلے بھڑک رہے ہیں اور کہیں اندر ہی اندر یہ آگ سلگ رہی ہے ہم دوسرں کے تماشے دیکھنے میں محو ہیں خود اپنے گھر کی خبر لیں تو پتا چلے خالہ بھی ایسے ہی کرداروں میں سے ایک تھیں جلتی پر تیل کے مصداق شروع ہو گئیں۔

''میری بہو کو تو مجال نہیں کہ میرے مہمانوں کے سامنے دم مار سکے، آگے پیچھے گھومتی ہے، ارے یہ آج کل کی لڑکیاں انہیں ذرا شہ مل جائے تو یہ آپے سے باہر ہو جاتی ہیں .....'' میں نے ان کی گفتگو کاٹ کر کہا۔

''معذرت کے ساتھ خالہ، اگر آپ کی بہو خوش اخلاق ،ملنسار ہے تو اس میں آپ کا کیا کمال یہ تو اس کی خوبی ہوئی ناں۔''

اب خالہ کو جوش آ گیا، ''پہلے دن سے لگام کس کر رکھی تھی میں نے تمہیں پتا ہے مرے یا جئے صبح فجر میں اٹھ کر میرا وضو کا پانی گرم کرتی ہے، پھر چائے بناتی ہے چائے کے بغیر میں بستر نہیں چھوڑ سکتی، میں نماز پڑھ لوں تو ناشتہ تیار ہوتا ہے پھر میری تسبیحات اور نفل نمازوں کا ٹائم ہوتا ہے۔ میرا ''بچہ'' اٹھتا ہے تو پھر اسکا ناشتہ تیار کرتی ہے پھر ہم ماں بیٹے ساتھ ناشتہ کرتے ہیں اس دوران گرم گرم ہر چیز لاتی ہے پھر باہر کا سودا سلف سارے گھر کا کام کاج مجال ہے جو تیوری پر بل بھی آئے، ذرا پٹڑی سے اترنے کی کوشش کی اور میں

اُسے ماں کے گھر بھیج دینے کی دھمکی دیتی ہوں ۔ ایک دم سیدھی ہو جاتی ہے پتا ہے وہاں تو کھانے کے لالے پڑے ہوئے ہیں، تین بہنوں کا اور بوجھ ہے باپ کے سر پر، یہاں کم از کم تین ٹائم پیٹ بھر کر کھانے کو تو ملتا ہے۔'' اس سے پہلے کہ خالہ کی لن ترانیاں سن سن کر امی خود رحمی کے سمندر میں ڈوب ڈوب جاتیں میں نے انہیں روکتے ہوئے کہا،

''خالہ آپ کو کتنی بیماریاں ہیں؟'' اور وہ میرے سوال پر حیران پریشان ہوگئیں۔''ہائیں تمہیں کیسے پتا چلا'' پھر اس کے بعد انہوں نے اپنی بیماریوں کی تمام تفصیلات جو بیان کرنی شروع کیں تو مجھے پھر ان کی بات کاٹنی پڑی۔

''خالہ آپ کو پتا ہے، اگر آپ صبح خود اٹھ کر اپنے وضو کا پانی گرم کریں، پھر ظاہر ہے ناشتہ خود بنائیں گی تو ایک کپ چائے سے زیادہ بنایا نہیں جائے گا ساتھ میں ایک سلائس لے لیں، پھر باہر کی مصروفیت بازار وغیرہ، سبزی گوشت لانا نمٹا دیں، تھوڑا بہت کاٹنا، صاف کرنا اور جو اپنی عمر صحت کے حساب سے کام کر سکیں وہ کر دیں تو آپ کی صحت کئی گنا بہتر رہے اس عمر میں کام چھوڑ دینا تمام بیماریوں کو دعوت دینے کا باعث ہے۔''

''ارے ہٹو'' وہ تنک کر گویا ہوئیں۔''اس عمر میں بھی آرام نہ کریں تو کب کریں گے۔'' میں نے ہنس کر کہا،'' آرام تو انسان کو قبر ہی میں ملتا ہے، کیونکہ قرآن کہتا ہے انسان مشقت میں پیدا کیا گیا ہے۔ اگر کوئی مشقت اللہ کم کر دے تو انسان خود ساختہ مسئلے، پریشانیاں اپنے اوپر لاد دے پھرتا ہے تو پھر خود ساختہ سے بہتر ہے جائز مشقت ہی اٹھا لے۔'' مگر ان کی سمجھ میں خاک نہ آیا مجھے ایک اور دلیل سوجھی''اچھا یہ بتائیے خالہ، جب سے بہو آئی ہے، آپ زیادہ بیمار نہیں رہنے لگیں؟'' میں نے ان کے ذہنی لیول کے مطابق سوال کیا ۔

اور پھر جو وہ شروع ہوئیں تو روکنا مشکل ہو گیا،'' دو تین ناقابلِ اشاعت گالیوں کے بعد،'' مجھے تو شروع سے ہی شک ہے کہ وہ کمبخت مجھ پر کچھ کرا رہی ہے، بیٹے کی شادی سے پہلے تو ماشاءاللہ میں بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ صبح سب کام کرتی تھی، ماشاءاللہ جوانوں سے زیادہ پھرتی تھی.....''

میں نے پھر ان کی بات کاٹ دی،''صبح ناشتے میں گرم گرم اصلی گھی کے پراٹھے، تلے ہوئے انڈے، بریانی، گھی میں تیرتے قورمے بناتی تھیں؟''

''ارے نہیں بھئی'' انہوں نے نفی کی،''بہو آئی تو تھوڑا سکھ ہوا ورنہ اتنا سب تو مجھ سے نہ ہوتا تھا اور کتنے ہی جھمیلے میری جان پر لگے ہوئے تھے۔''

میں نے جل کر کہا،'' پہلے آپ کام زیادہ کرتی تھیں، خوراک سادہ لیتی تھیں، اب آپ نے سب کام کاج سوائے زبان چلانے کے چھوڑ دیئے اور خوراک وہ لے رہی ہیں جو پہلوان کو اکھاڑے میں اترنے کے لئے چاہیے۔ آپ کو پتا ہے یہ ساری چکنائیاں آپ کے اندر جمع ہو رہی ہیں، روز دل بیٹھتا ہوگا، سینہ جلتا ہوگا، جی گھبراتا ہوگا مگر ہم کہاں خاموش پکار کا جواب دیتے ہیں کسی دن بہو کی خاموش آہیں رنگ لے آئیں اور دل ہی بیٹھ گیا تو .....آجکل تو روزانہ ہی خبریں سنتے ہیں فلاں بھلا چنگا تھا سویا اٹھا نہیں، گھر کے دروازے پر

پیر رکھا دوسرا قدم اٹھانے کی نوبت ہی نہ آئی.....''

میری بات کا مفہوم سمجھ کر خالہ کا رنگ ایک لمحے کے لئے فق ہوا پھر وہ اپنے اصلی کرارے لہجے میں بولیں ،ائے ہئے !''زیب النساء یہ تری بیٹی تو بہو سے بھی دو ہاتھ آگے ہی ہے۔ میں تو چلی ،کمبخت کو حیا نہ آئی خالہ کو مرنے کی بد دعائیں دے رہی ہے.....''

امی نے بہتیرے روکا مگر انہوں نے صاف کہہ دیا ''جب تک تیری بیٹی ہے میں تو نہیں آؤں گی ۔'' میں نے دل میں سوچا،''یہ میری والدہ کے حق میں بہت بہتر ہے۔'' اور امی سے کہا،''جاہلیت کا کوئی علاج نہیں ،مگر آپ تو تعلیم یافتہ ہیں، بات کو سمجھ سکتی ہیں آپ نے کیوں اپنے دل کی تمام کھڑکیاں ، دروازے بند کر لئے ہیں ،حبس نہیں ہوتا ؟ گھٹن نہیں ہوتی ؟''اور انہوں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا،''کیا کریں ربیعہ؟ پورے معاشرے میں یہی ہو رہا ہے ، جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون ہے جہاں بہو غالب آجائے ساس کی اوقات دو ٹکے کی کر کے رکھ دیتی ہے اور جہاں ساس کو موقع ملے وہ بہو کی اوقات نوکروں سے بھی کم کر دیتی ہے ،تم کیا چاہتی ہو میں اپنا بیٹا پلیٹ میں رکھ کر بہو کے حوالے کر دوں ، جاؤ بھئی عیاشی کرو میری عمر بھر کی کمائی پر اور پھر جب بہو ٹھینگا دکھا کر بیٹے کو لے کر چلی جائے تو گھٹ گھٹ کر مر جاؤں؟''

میں نے تاسف سے کہا،''امی اگر ظلم رائج ہو جائے تو دلیل نہیں بن جاتا ، اگر ناحق کا رواج ہو جائے تو وہ انصاف نہیں بن جاتا ، امی اکثریت چاہے کچھ بھی کرے ہمیں غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہنا چاہیے اس میں ہماری ابدی فلاح ہے ۔ چاہے دنیا میں تھوڑا بہت نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ معاشرے میں اچھی مثالیں بھی تو ہیں آپ انہیں کیوں نہیں دیکھتیں وہ پچھلی گلی میں جو کرنل انکل رہتے تھے یاد نہیں پہلے دن سے بہو کو صحیح جگہ دے کر رکھا، صبح دونوں بڈھا بڈھی اٹھ کر ناشتہ کر لیتے نئے نویلے شادی شدہ بہو بیٹے کا انتظار کیوں کریں ، جب تک ہاتھ پاؤں چلتے ہیں انہیں کیوں زحمت دیں ۔ سیدھا کالج سے اٹھا کر بہو لے آئے تھے، گھر داری کی الف سے یے تک خود سکھائی ۔ یاد ہے میں اور آپ اکثر ان کی تعریف کیا کرتے تھے۔ جب تک زندہ رہے اپنی ذات سے دوسروں کو فیض پہنچاتے رہے اور جب مرے تو آج بھی بہو کتنی محبت سے ، احسان مندی سے انکا ذکر کرتی ہے۔ امی ! جبر کے کے مقابلے میں محبت کی زنجیر کئی گنا زیادہ طاقتور اور مضبوط ہوتی ہے۔ آپ آزما کر تو دیکھیں بس تھوڑا صبر کرنا پڑتا ہے۔''

اتنا کہہ کر میں خاموش ہو گئی امی بھی چپ چاپ بیٹھی تھیں میں نے انہیں اکیلا چھوڑ دیا میں چاہتی تھی وہ خود بھی کچھ سوچیں ، اصل مسئلہ یہ تھا کہ امی پھر بھی ہاتھ آجاتی تھیں مگر حماد گھر میں ملتا ہی نہ تھا۔ دیر سے گھر آتا اور مجھے صبح کی نماز کے لئے جلد سونے کی عادت تھی لہٰذا اس مسئلے کے حل کے لئے بھی مجھے امی ہی سے رجوع کرنا پڑا،''یہ حماد گھر کس وقت آتا ہے؟ میں نے اگلے ہی دن باتوں باتوں میں کہا، وہ تو خود بیزار بیٹھی تھیں کیا کہتیں ؟'' میں مدتوں اس لڑکے کی شکل دیکھنے کو ترس جاتی ہوں ، نہ معلوم باہر کس قسم کے لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا ہوگا بہر حال رات گئے کوئی شریف لوگ تو گھر

سے باہر نہیں رہتے۔'' میں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا، ''پھر میں کچھ کہتی ہوں تو آپ کو برا لگتا ہے، اگر یہی بیٹا بہو کے پاس بیٹھے تو کم از کم یہ اطمینان تو ہوتا ہے کہ چلو محفوظ ہاتھوں میں ہے، امی جوان ہو کر لڑکوں کو ہاتھوں سے نکلنا تو ہوتا ہی ہے کیوں نہ بہتر ہاتھوں میں پہنچیں؟''

وہ سارا ہی دن میں بہت بے چین رہی۔ میری بے چینی کی کئی وجوہات ہیں نمبر ایک میں نے امریکہ میں بے حیائی کے طوفان سے ڈر کر بچوں کی اچھی تربیت کے شوق میں اسلامک سینٹر جوائن کر لیا ایک عرصہ قرآن اور اچھے لوگوں کی صحبت ملی تو یہ احساس ہوا ہم کتنی سطحی زندگی گذارتے ہیں، ہم نہ سوچنا چاہتے ہیں نہ سمجھنا۔ ایک مرد اور عورت کے سنگم سے گھر کی بنیاد کیوں رکھی اللہ نے؟ مغرب نے تو خیر اپنی عقلمندی میں خودکشی کا راستہ اختیار کر لیا انہوں نے گھر کو ایک مرد کی مطلق العنانیت کی تسکین بنا کر عورتوں کو اس چکر سے آزاد کر دیا۔ اب عورتیں سستی مزدور بنیں، کارخانوں، فیکٹریوں میں کام بھی کریں مردوں کا دل بھی لبھائیں، ضرورت بھی پوری کریں، مرد پر ایک خاندان کا بوجھ بھی نہ پڑے اور پھر single parent (ایک ماں پر مشتمل) خاندان بنا کر رنگ رنگ کے بچے پالیں۔ (جاری ہے)

نصرت یوسف

بنجر رشتے

سنا ہے لیاقت بھائی حج پر جا رہے ہیں، بیگم مونا معظم نے بھاپ اُڑاتی چائے کا کپ مسہری کی سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے میاں کو اطلاع دی۔

''ہوں''، معظم صاحب نے سرسری سی نگاہ اٹھائی اور پھر کتاب پر نظریں گاڑ دیں۔

''چائے پی لیجئے میں نے ہاٹ ٹی بنائی ہے آئس ٹی نہیں۔'' اپنی دی ہوئی اطلاع پر میاں کا کوئی ردعمل نہ پا کر انہوں نے چڑتے ہوئے کہا۔

''حنا بتا رہی تھی کہ تایا جی اور تائی اپنے بیٹے بہو کے ساتھ حاجی کیمپ میں نظر آئے تھے۔''

''اچھا'' میاں نے پھر محض ایک لفظ پر گذارہ کیا اور چپ رہے۔ اب کی بار ان کی توجہ کتاب کے بجائے چائے پر تھی۔ میاں کی اس حد درجہ بے نیازی پر مونا بیگم بد دل سی ہو گئیں خاموشی سے خالی کپ اٹھاتے ہوئے میاں کو متوجہ کرنے کی انہوں نے ایک کوشش اور کی۔

''صرف علم حاصل کرنا ہی عبادت نہیں میاں صاحب فیملی کو وقت دینا بھی ثواب ہے۔''

اُن کی یہ کوشش کامیاب رہی معظم صاحب نے کتاب بند کرتے ہوئے خفا خفا سی بیوی کو دیکھا ''جی ارشاد۔''

میاں کو متوجہ پا کر مونا بیگم نے ہاتھ میں تھاما چائے کا کپ دوبارہ میز پر رکھ دیا اور مسہری کی پائنتی پر ٹک گئیں۔

''میں کہہ رہی تھی کہ آخر آپ لیاقت بھائی سے کہتے کیوں نہیں'' انہوں نے مبہم سی بات کی۔

''کیا''، معظم صاحب نے حیرانی سے بیوی کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''بھئی یہی کہ ابا مرحوم کی جائیداد میں جو آپ کا حصہ بنتا ہے وہ ادا کر دیں۔ ہر سال بڑی پابندی سے حج اور عمرہ کرتا ہے پورا خاندان، جہاں معاملے کی بات آتی ہے وہاں اپنا قبلہ کعبہ ہی بدل لیتے ہیں۔''

مونا بیگم کی آواز میں خاصی تلخی تھی اور ایسا ہونا فطری تھا۔ معظم صاحب یہ بات بخوبی جانتے تھے کہ اُن کی فیملی کی فکریں بہ آسانی دور ہو سکتی ہیں اگر لیاقت بھائی انکا حق ادا کر دیں۔

سلیمان صاحب کی کُل اولاد دو ہی بیٹے تھے۔ بڑے لیاقت اور لیاقت سے پانچ سال چھوٹے معظم، معظم بچپن میں پولیو کا شکار ہو گئے تھے۔ اماں نے معظم کو دنیا میں جینا سکھانے کے لئے ان کی توانائیوں کا رخ تعلیم کی طرف موڑ دیا تاکہ ان کو کسی طرح کا احساس کمتری دنیا کے سامنے محسوس نہ ہو۔ لیاقت بھائی انٹر کرتے ہی ابا کے ساتھ پریس میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ پڑھائی سے زیادہ انکا ذہن کاروبار

میں چلتا تھا جمع اور تفریق کرنے کے فن میں طاق لیاقت بھائی نے ابا کے لگائے پودے کو ابا کے ساتھ ملکر اونچا کیا اور اونچا اور پھر اور اونچا۔ دوسو گز کے گھر سے نکل کر پانچ سو گز اور پھر ہزار گز کا بنگلہ لیاقت بھائی کے مشورے سے خریدا گیا۔ یہاں آکر ابا اماں نے بڑے بیٹے کی شادی خاندان کی خوبصورت ترین لڑکی سے کردی۔ اب تو مانو لیاقت بھائی کے پیرز مین پر ٹکتے ہی نہ تھے۔ اماں بھی اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے بعد شاید اتنا تھک گئی تھیں کہ خاموشی سے ایک صبح اپنی آخری آرام گاہ کی طرف چلی گئیں۔ اماں کا ساتھ کیا چُھوٹا، ابا بجھ سے گئے تھے۔ معظم کے سر پر ہاتھ پھیرتے تو اکثر معظم کو ان کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ محسوس ہوتی۔ جرنلزم میں ماسٹرز کرتے معظم کو ابا نے بیوی کی خواہش کے مطابقِ کاروبار کے بجائے تعلیم کی طرف متوجہ رکھا کیونکہ اُن کو معلوم تھا کہ ان کا یہ بیٹا کاروبار کے لئے درکار بھاگ دوڑ نہیں کر پائے گا۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ جلد از جلد اپنی زندگی ہی میں اثاثوں کی تقسیم کردیں تاکہ کسی کی بھی حق تلفی نہ ہو۔ کوئی ان کی دل کی بات جانتا تو ان کو اصل خدشہ معظم کے محروم رہ جانے کا تھا۔ لیاقت بلا شبہ منجھے ہوئے کاروباری انسان تھے جبکہ معظم کاروباری اونچ نیچ اور اسرار و رموز سے نا آشنا، ٹانگوں سے معذور۔

معظم کی خوبصورت یادوں میں وہ دن محفوظ تھا جب ماسٹرز کے بعد ملک کے ممتاز اخبار میں بحیثیت میگزین ایڈیٹر ان کا تقرر ہوا۔ معظم کے لئے بلا شبہ یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ ابا، لیاقت بھائی، بھابھی اور بچوں نے اس خوشی کو مشہور ہوٹل میں ڈنر کر کے منایا تھا۔ سب ہی بہت خوش تھے اور بس معظم کا وہ ابا اور لیاقت بھائی کی فیملی کے ساتھ آخری ڈنر تھا۔ ابا ان کی زندگی کی مزید کوئی بہار دیکھے بنا جلدی رخصت ہو گئے۔

ابا کیا گئے دنیا ہی بدل گئی ۲۳ سالہ معظم کو لفظ ''یتیم'' پہلی بار اپنی پوری گہرائیوں کے ساتھ سمجھ میں آیا۔ اور پھر اپنی خودداری اور عزت پر آنچ لئے بنا انہوں نے ہر آسائش کو چھوڑ کر اپنی دنیا اپنے بل پر بنانے کا ارادہ کرلیا۔

وہیل چیئر پر بیٹھے معظم صاحب آج ۲۵ سال بعد بھی یقیناً اس جگہ نہیں پہنچ سکے تھے جہاں سے وہ ۲۵ سال قبل اپنا سرمایہ خود داری لیکر نکلے تھے۔ جبکہ لیاقت بھائی مزید آگے بڑھ چکے تھے۔ اس دوران معظم نے کئی مرتبہ بڑے بھائی سے اپنے حق کا تقاضا بھی کیا مگر کبھی ان کو کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ملا اور وہ ''با ادب با نصیب'' پر عمل کرتے ہوئے خاموش ہو جاتے ..... اپنے طور پر بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی پر بڑا احسان یہ کیا تھا کہ دوسو گز کا وہ مکان جو ابا نے اپنے انتقال سے قبل معظم کی معاشی سہولت کے خیال سے لیا تھا وہ ان کے حوالے کر دیا گیا اور اسی چھت کے نیچے معظم آج تک رہ رہے تھے اور یہی وہ مادی آسرا تھا جس کے بل پر شادی سمیت زندگی کے کئی مراحل نسبتاً آسانی سے طے ہو گئے تھے۔ لیکن کون یقین کرسکتا تھا کہ کری ایٹو بلڈرز کے مالک لیاقت سلیمان اور معظم سلیمان آپس میں سگے بھائی ہیں۔

ان دنوں دو بڑے مسائل نے مونا بیگم کو پریشان کیا

ہوا تھا۔ سال کے آخر میں حنا سے چھوٹی سوہا کی شادی اور بیٹے کے پرائیویٹ یونیورسٹی میں داخلے کے بھاری اخراجات..... ان ہی تفکرات کے تحت آج پھر وہ پرانے موضوع کو لے بیٹھیں۔ حالانکہ اُن کو معلوم تھا کہ بڑی بیٹی حنا کی شادی کے موقع پر بھی معظم صاحب نے بھائی کو یاد دہانی کرائی تھی تو بڑے بھائی کے جواب نے اُن کو ششدر کر دیا تھا۔

''معظم، ابا کا اپنا تھا کیا! تم اتنے بھی چھوٹے نہ تھے جب میں نے ابا کے ساتھ پریس جانا شروع کیا تھا۔ ایک چھوٹا سا پریس، چھوٹا سا گھر اور پرانی سی گاڑی۔ یہ میں تھا جس نے کام کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ ابھی معظم سوچ ہی رہے تھے کہ بھائی کی اس بات پر کیا کہیں کہ وہ پھر بول اٹھے ۔

''اگر میں غلط ہوں تو خود بتاؤ۔'' بھائی کی طرف مشروب کا گلاس بڑھاتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ''ابا تو بلڈر نہ تھے مگر میں یہاں بھی کامیاب ہوں الحمدللہ۔''

لیاقت بھائی نے بات مزید آگے بڑھائی۔ اُن کی ''میں'' کے ساتھ ''الحمدللہ'' معظم کو نہایت عجیب سی لگی اور معظم جیسے منجھے ہوئے جرنلسٹ کو بھائی کے باریش چہرے پر کثرت سجدہ کے نشان نے کسی ممکنہ گستاخی سے باز رکھا۔ حالانکہ وہ کہنا چاہتے تھے کہ ''بھائی جی ہر بیج میں پنپنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور ہر پودا درخت بھی نہیں بنتا اور ہر درخت ثمر بار بھی نہیں ہوتا۔ اصل بنا تو بیج ہی ہوتا ہے۔ جتنا زور آور بیج اتنا نتیجہ خیز انجام متوقع۔ ابا کا بویا ہوا بیج اور اُس سے نکلا ہوا بظاہر کمزور سا پودا اپنے اندر اتنی قوت رکھتا تھا کہ وہ ابا اور آپکی مشترکہ کوششوں سے تیزی سے پھلا پھولا۔ بیج آپ نے نہیں بویا تو تمام تر ثمرات کے حقدار آپ کیسے ہو گئے۔''

مگر معظم یہ سب صرف سوچ کر رہ گئے تھے اور مشروب کے آخری گھونٹ حلق سے اتارنے انہیں دوبھر ہو گئے تھے۔ واپسی میں بھائی کے وسیع کار پورچ میں کھڑی چمچماتی گاڑیوں نے ان کے دل میں کوئی ہلچل نہ مچائی مگر ان کا سترہ سالہ بیٹا حماد جو باپ کے ساتھ گاڑی ڈرائیو کر کے آیا تھا، باہر گاڑی میں ہی انکا انتظار کرتے ہوئے رشک سے تایا کے گھر کو دیکھ رہا تھا، جہاں اس کا آنا اب دونوں بھائیوں کے سرد تعلقات کی وجہ سے زندگی میں دو چار بار ہی ہوا تھا۔

''ڈیڈی یہ وہی گھر ہے جہاں آپ رہا کرتے تھے'' حماد نے گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں یہ وہی گھر ہے''

''واہ ڈیڈی آپ تو 'بڑے آدمی تھے'' اس نے بڑے پر زور دیتے ہوئے شگفتگی سے کہا تو معظم اس کے بڑے کہنے پر بے ساختہ ہنس پڑے۔

اس دن کے بعد سے معظم صاحب نے عہد کر لیا تھا کہ اب وہ لیاقت بھائی سے اس موضوع پر کبھی کوئی بات نہ کریں گے۔

''میں نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑا۔ اب تم بھی آئندہ یہ موضوع نہ چھیڑنا۔''

بھائی سے ملاقات کا احوال سنانے کے بعد انہوں نے

بیوی کو تاکید کردی ۔ مزاج آشنا مونا بیگم میاں کی دلی کیفیات کو بخوبی سمجھتی تھیں لہٰذا انہوں نے بھی اس معاملہ میں خاموشی اختیار کرلی ۔مگر ملک کے حالیہ سیاسی اور معاشی بحران نے دوسروں کی طرح ان کے اخراجات کو بھی کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا۔آمدنی اور اخراجات کے عدم توازن نے مونا بیگم کو پریشان کر رکھا تھا ۔خصوصاً شادی کے اخراجات انہیں پہاڑ سے لگ رہے تھے۔ پہلے تو اس لئے حنا کی شادی کے 3 سال بعد سوہا کی شادی کے موقع پر انہیں میاں کی تنبیہہ یاد نہ رہی اور وہ پھر پرانی بات لے بیٹھیں۔ پہلے تو معظم صاحب نے ان کی بات کو سنی ان سنی کر دیا لیکن ہمیشہ سے میاں کی نبض شناس مونا بیگم لگتا تھا کہ آج تیکھے مزاج میں ہیں۔

''لیاقت بھائی آئے تھے میرے آفس''، معظم صاحب نے سرسری لہجہ میں اطلاع دی۔

''اچھا پھر'' بیوی نے تجسس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''پانچ لاکھ کا چیک لیکر آئے تھے بھائی''

''پانچ لاکھ کا'' مونا بیگم نے حیرت اور صدمے سے ملا جلا تاثر دیا۔

''ہاں پانچ لاکھ کا'' ۱۹۸۴ء میں جب ابا کا انتقال ہوا تو کل اثاثے اُن کے بقول ان کی محنت کے شیئر کے علاوہ ۳۰ لاکھ تھے۔۱۰ لاکھ کا گھر انہوں نے میرے حوالے فوراً ہی کر دیا تھا۔ بقایا ۵ لاکھ وہ مجھے اب ۲۵ سال بعد دینے آئے تھے ۔'' رنج اور غم کے احساس نے معظم صاحب کی آواز میں تلخی گھول دی تھی۔

''پانچ لاکھ اور وہ بھی ۲۵ برس بعد! ان کی کوٹھی، ابا کا پریس اور دوسرے اثاثوں کا یہ حصہ!'' بیوی نے حساب کتاب شروع کر دیا محنت کے شیئر کے نام پہ اللہ جانے کیا کچھ ان کے لئے جائز ہو گیا ہے۔'' مونا بیگم نے تلملاتے ہوئے کہا۔

جب وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال چکیں تو انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی باتوں سے میاں کا چہرہ مزید افسردہ ہو گیا ہے ان کو لگا شاید وہ کچھ غلط کہہ گئی ہیں۔

''سوری معظم میری بات نے آپ کو مزید پریشان کر دیا ہے۔''

میاں کی کیفیت دیکھ کر مونا بیگم نے فوراً ہی اپنی بات سمیٹ دی اور خاموشی سے چائے کے اس کپ کو اٹھاتی کھڑی ہو گئیں جس کے تلے میں چائے کے آثار جم کر کھرنڈ سے بن گئے تھے۔نل کے نیچے اسفنج کپ پر پھیرتے ہوئے وہ سوچ رہی تھیں کہ وقت نے ۲۵ سال قبل کی پرحرارت کرنسی کو چائے کے اس داغ کی طرح سرد کر دیا ہے۔ رگڑ رگڑ کر دھونے سے کپ تو اجل گیا تھا مگر رویوں کے داغ دل پر تہہ بہ تہہ کائیاں جماتے قریبی رشتوں کو بنجر بنا دیتے ہیں۔

کپ کو احتیاط سے سیٹ کرتے ہوئے مونا بیگم نے ایک گہری سانس لی اور میاں کے فیصلے سے متفق ہو گئیں۔

☆☆☆

امینہ بتول

اُجالے

کالی گھٹائیں اور پھر شام کا سیاہ رات میں بدلتا وجود مجھے دونوں چیزیں ناپسند تھیں۔ مجھے ہر اس چیز سے نفرت تھی جس میں سیاہی کا شائبہ بھی ہو یا جس میں تاریکی کا گمان بھی پایا جائے۔

رات کے ہیولے مجھے سونے نہیں دیتے تھے۔ بڑی مشکل سے آنکھوں میں نیند اترتی کیونکہ مجھے آنکھیں بند کرنے سے بھی خوف آتا پل بھر میں ہر رنگ غائب! کچھ نہیں دکھتا.....بس اندھیرا۔

رات تو خیر صبح میں بدل ہی جاتی ہے، اجلا اجلا نکھرا ہوا روشن دن نکل آتا ہے مگر میں ان اندھیروں کا کیا کرتی جنہوں نے مکمل طور پر میری زندگی کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ میں ان سے بدکتی، دور بھاگتی، کتراتی تو بھی سیاہی کے اژدھے منہ کھولے مجھے نگلنے کو بے تاب رہتے۔ ایک یہ مفلسی کا اندھیرا کم تھا!

انہی تاریک حالات نے مجھ سے بچپن کی معصوم خواہشات جوانی کی شوخیاں سب کچھ چھین لیا تھا۔ میں مستقبل کے خواب دیکھنے سے بھی ڈرتی تھی.....میرے اندر صرف وحشتیں تھیں.....خلا تھا! پھر کیسے مجھے اندھیروں سے نفرت نہ ہوتی۔

اور اماں .....اس صدی کی سب سے معصوم عورت!

پتہ نہیں کیوں انہیں یہ اندھیرے نظر نہیں آتے تھے۔ وہ امید کے جگنو آنکھوں میں اس طرح روشن رکھتی تھیں کہ نہ تو گھر کے بوسیدہ در و دیوار انہیں ہولاتے اور نہ فاقے متاثر کرتے۔ اماں کے پاس معمولی سے کچھ بدتر دو تین جوڑے تھے اور چاندی کا ہلکا زیور۔ یہی کل متاع تھی۔ ہاں دو چیزیں بڑی وافر تھیں۔قناعت اور شکر۔

ابا بھی کم و بیش اماں جیسے ہی تھی۔ اپنے مدار پہ قانع انسان! وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کی زندگی کی واحد عیاشی دو وقت کی حلال روٹی اور ستر پوشی کا کپڑا ہوتی اور یہی عیاشی ان کی سفید پوشی بلکہ غربت کا بھرم بھی رکھتی۔

اور پھر انہیں زندگی کی نعمتوں، خوبصورتیوں، رنگوں میں سے کچھ نہیں چاہیے ہوتا کہ اوقات اجازت نہیں دیتی۔ کنویں کے مینڈک!

اور میں اماں ابا کی اکلوتی اٹھارہ سالہ بیٹی نازش! اماں مجھے پیار سے ناز یا نازی کہتیں تو میں بہت چڑتی کیونکہ میرے پاس ناز کرنے کے لئے کچھ نہیں تھا سوائے شکل و صورت کے جو البتہ کافی بہتر تھی۔ خیر اس پر بھی کیا ناز کرتی! کئی بار دھلے بدرنگ کپڑوں میں تو حسن بھی بے کشش لگتا ہے۔ موتی کو ریشم یا کمخواب میں لپیٹو تو ہی وہ جاذب نظر ہوتا

ہے ورنہ کھدر یا چھینٹ کے غلاف تو موتی کو بھی بے وقعت کر دیتے ہیں۔

اندرون شہر میں دو کمروں کا پرانا گھر جو ابا کا آبائی مکان اور ہم تین نفوس کی جائے پناہ تھا۔ ابا یومیہ اجرت پہ کام کرنے والے مزدور تھے جن کی ناکافی کمائی کا زیادہ تر حصہ میری تعلیم پہ خرچ ہوتا۔ کالج شہر کے اچھے اداروں میں سے تھا اور تعلیم کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح جاری ہی تھا چاہے اماں ایک وقت روٹی نہ پکاتیں اور ابا اضافی کام میں صبح سے رات تک اپنی ہڈیاں گلاتے۔

مجھے کھانے کے لئے سوکھے نوالے اور تن ڈھانکنے کا کپڑا تو مل جاتا مگر کاش کوئی سمجھے کہ زندگی اس سے بڑھ کر بھی کچھ مانگتی ہے۔ ہر انسان بہتر سے بہترین چاہتا ہے۔ مجھے تو بہتر بھی میسر نہیں تھا۔

روٹی کے ٹکڑے اس لئے کہ سانسیں چلتی رہیں اور جسم و روح کا رشتہ برقرار رہے اور معمولی سستا کپڑا اس واسطے کہ ہم بھی کسی نہ کسی طرح ''انسان'' کہلائیں کیونکہ کھاتے پیتے تو جانور بھی ہیں، مگر جسم صرف انسان چھپاتے ہیں۔ جانوروں کو اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اماں ابا اور میں، ہم تین افراد کی اس تکون میں صرف ایک مشترک خواہش تھی اور وہ تھی میری تعلیم اور اس آرزو کی لو بڑھانے میں ابا لمحہ لمحہ اپنی ہڈیوں کا ایندھن ڈالتے ہوئے بے تحاشا کمزور ہو چکے تھے!

اماں نجانے کون سی دعائیں مانگتیں کہ سجدے میں گرتیں تو انہیں سب کچھ بھول جاتا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ یہ صبر و شکر کے سجدے ہیں یا طلب کے مگر ان کے چہرے کی طمانیت حیران ضرور کرتی تھی۔

بجلی کا برائے نام کنکشن پتہ نہیں کن وقتوں میں اور کیسے ابا نے لیا تھا ورنہ بل کی عدم ادائیگی کے سبب ہمارے گھر کی بجلی منقطع ہونا عام بات تھی۔ ہاں پڑھائی کے لئے اماں نے مجھے ایک لالٹین ضرور دے رکھی تھی۔ بیسیوں مرتبہ کی تاکید کے ساتھ کہ اسے احتیاط سے استعمال کروں اور سچ تو یہ ہے کہ لالٹین اپنا مقصد خوب پہچانتی تھی، رات گئے تک پڑھنے کے بعد مجھے اسے بجھانا نہیں پڑتا تھا۔ وہ اتنی پرانی تھی کہ مدھم ہو کر خود ہی اندھیرے میں گم ہو جاتی۔

ہاں البتہ رات کی سیاہی کا ایک احسان ضرور تھا مجھ پہ کہ یہ میرا ہیبت ناک اصل چھپا لیتی، میری حقیقت کا پردہ رکھ لیتی ورنہ دن کی روشنی میں محلے سے گزرنے والا کوئی بھی فرد ہمارے مکان پہ دوسری نگاہ ڈالنا پسند نہیں کرتا تھا اور میں خود ایک بے مول تعارف، بے وقعت شناخت کے ساتھ کالج جاتی تھی یا اپنی معمولی شناخت کو گھر میں ہی دفن کر کے نکلتی۔

کالج کی دنیا میرے اندر حسرتوں کے ایسے سناٹے ڈال دیتی کہ مجھے اپنی ذات سے خوف آنے لگتا..... اپنے آپ سے نفرت ہوتی اور میں خود سے چھٹکارا پانے کی سعی کرتی مگر کیسے؟ دنیا میں ہمیشہ ''کچھ دو اور لو'' کا اصول چلتا ہے۔ میں لینا تو چاہتی تھی مگر دینے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ خواب خریدنے کے پیسے نہیں تھے تو انہیں آنکھوں میں سجانے کا حق بھی نہ تھا۔

کالج میں سب سے نمایاں چیز میری تعلیمی قابلیت تھی

مگر میرے لئے بیکار رہی تھی۔اس قابلیت پہ مجھے سراہا جاتا مگر یہ میرے طلسماتی سپنوں کی تعبیر تو نہ تھی اور کوئی مجھ سے پوچھ لیتا کہ میں کس کی بیٹی ہوں، کہاں رہتی ہوں تو میرا بہترین جواب ''خاموشی'' ہوتا۔نازش افضل کو صرف اچھی طالبہ کے طور پر جانا جاتا مگر بہر حال قیاس کرنے والے بہت کچھ اندازہ لگا لیتے، میرے معمولی کپڑوں اور جوتوں سے!

اور ایک رات جب گرجتے بادلوں سے ٹپ ٹپ برسنے والا پانی ہمارے کمرے کی چھت میں بے رحمی سے چھید کرتا ہوا بوند بوند گرنے لگا تو میں بہت ڈر گئی۔ابا کی خالی جیب، اماں کا لاچار وجود، میرا بوجھل دل اور اندھیرا.....

میں تڑپی اور سسک سسک کر بے تحاشا روئی۔اتنا کہ اماں ابا بھی پریشان ہو گئے۔

کافی دیر بعد اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے میں نے ایک حتمی فیصلہ کر لیا جو آسان نہیں تھا۔مگر مجھے ہر قیمت پہ اپنے خواب حاصل کرنے تھے۔مجھے بہترین زندگی چاہیے تھی اور ایک شارٹ کٹ راستہ موجود تھا۔

اندھیرے کی دنیا میں نے کبھی اپنی تسلیم ہی نہیں کی تھی اور اب میں اس جہاں میں قدم رکھنا چاہتی تھی جہاں رنگ و نور ہوں، قوس قزح، پھول، بہاریں، خوشبو سب کچھ ہو اور ان سب کے لئے اندھیروں کو شکست دیتی تھی۔''کچھ دو اور لو'' کے تحت صرف ایک چیز قربان کرنی تھی اور بدلے میں، میں ہر آرزو مسخر کر سکتی تھی۔

میں نے فیشن شو کا ''ماڈلنگ پمفلٹ'' غور سے دیکھا اور اگلے دن چپکے سے مونا کو ہاں کر دی۔مونا، میری کلاس فیلو شہر کی سب سے امیر اور با اثر فیملی کی بیٹی تھی۔اس کے پاپا کی ذاتی ایڈورٹائزنگ ایجنسی تھی اور وہ اکثر کالج کی لڑکیوں کو ماڈلنگ آفرز کرتی رہتی تھی۔مجھے بھی متعدد بار کہا مگر میرا ماحول اور تربیت اس کی اجازت نہیں دیتے تھے اور پھر میں محرمیوں کا شکار ایسی لڑکی تھی جس میں قوت فیصلہ اور خود اعتمادی کی کمی تھی۔

تاہم اس رات مونا کے دیئے ہوئے پمفلٹ کی صورت میں مجھے ہزاروں خواب پورے ہوتے نظر آئے تو میں نے لحظہ بھر کی دیر بھی نہ کی۔پچاس ہزار روپے کا پراجیکٹ تھا اور یہ میرے لئے ایک بڑا معاوضہ تھا۔اگرچہ اس کی قیمت میری ''حیا'' تھی مگر اس وقت یہ سودا بہت معمولی لگا۔

''زبردست، یہ لڑکی کمرشل کے لئے بہت موزوں رہے گی۔اس کی لُکس کافی دلکش ہیں۔'' اگلے ہی دن کالج کے ہاف ٹائم میں، میں مونا کے ساتھ اس کے پاپا کے آفس میں موجود تھی اور وہ شخص سگار پیتے ہوئے بڑے ناقدانہ انداز میں میرا ''جائزہ'' لے رہا تھا۔تین چار مردوں نے نہایت جانچتی نگاہوں سے میرے سراپے کو ''اوکے'' کیا تو احساس ہوا کہ حیا اتنی بے مول نہیں ہوتی جتنی میں نے سمجھی تھی!

میں لڑکھڑائی مگر پھر سنبھل گئی۔اب پلٹنا دوبارہ اندھے کنویں میں گرنے کے مترادف تھا۔

میک اپ روم میں سب سے پہلے میری چادر سر سے اتاری گئی۔اماں نے جس آنچل کو آبرو کی دولت کے ساتھ

میرے سر پہ ڈالا تھا وہ متاع آسانی سے چھین لی گئی اور میں مزاحمت بھی نہ کرسکی۔ ہیئر سٹائلسٹ نے میرے لمبے بالوں کو شولڈر کٹ دیا تو میں آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر مبہوت رہ گئی۔ یہ میں نہیں تھی کوئی اور نازش تھی جس کا سراپا بے حد نکھر آیا تھا مگر جس کی نسوانیت سر جھکائے کھڑی تھی۔

اور پھر جو لباس مجھے دیا گیا، میں خود سے بھی نظریں چرا گئی مگر یہاں بار بار جتایا گیا کہ اس کمرشل کے پچاس ہزار کا ایڈوانس چیک مجھے دیا گیا ہے عزت نفس کی بھی تذلیل!

اسٹوڈیو میں مرد فوٹو گرافر بڑی بے باکی سے میرے کندھے چھو چھو کر زاویے اور پوز درست کر رہے تھے۔ میں صرف ایک ظاہری حسین مورت تھی ورنہ میرا اندر، میری روح راکھ کا ڈھیر بن چکی تھی۔ روشنی کی دنیا نے میرے ظاہر کو جلا تو بخش دی مگر اپنے سارے پس پردہ اندھیرے میرے اندر اتار کر.....حساب برابر تھا!

فوٹو شوٹ مکمل کروانے کے بعد میں نے گھڑی دیکھی تو دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ کالج سے چھٹی ہو چکی تھی۔ گھر واپسی پہ میں ایک مختلف نازش تھی۔ اتنا کچھ پا کر بھی میں خالی ہاتھ تھی کیونکہ میں نے حیا کو کھو دیا تھا۔ اماں سے زندگی میں پہلی بار جھوٹ بولا۔ انہوں نے میرے بدلے ہوئے چہرے اور کٹے بالوں کو دیکھا تو مزید کچھ نہ پوچھا۔ میں اپنی نظروں میں گر گئی۔ چیک ان کے قدموں میں ڈال دیا۔ اماں نے دکھ سے مجھے دیکھا اور پھر نفرت سے منہ موڑ لیا۔

غیرت مند ماں اپنی حیادار بیٹی کو ماڈل گرل کے روپ میں برداشت نہ کرسکی۔

ابا ڈھے سے گئے۔ میں اپنی ساری خواہشات پوری کر سکتی تھی، اماں ابا کا سہارا بن سکتی تھی مگر انہوں نے نگاہ اٹھا کر بھی میرے پیسوں کی طرف نہیں دیکھا۔ کیسی عجیب بات تھی، میں پا کے بھی کھو چکی تھی، جس گھر کا دیا میں اپنی حیا کی راکھ سے روشن کرنے چلی تھی، میرے والدین کو وہ اجالا ہرگز گوارا نہیں تھا۔ میں ان کی اور اپنی عزت کی مجرم تھی!

دو ماہ بعد بڑے مشینی انداز میں میں دوسرا کمرشل کرنے اسٹوڈیو میں موجود تھی میرا وجود جذبات سے عاری ایسی موم گڑیا کا تھا جو زمانے کے ہاتھ میں تھی کہ جیسے چاہے ڈھال لے۔

فوٹو شوٹ سے پہلے ایک مرد ساتھی نے میرے حسن کو بے حد سراہا اور اس ستائش کی ''وصولی'' طلب کی تو میں سرتاپا کانپ گئی..... میں نے چیخ کر بتانا چاہا کہ میں بکاؤ مال نہیں ہوں، صرف نازش افضل ہوں جو عزت دار ماں باپ کی بیٹی ہے۔ میں تو صرف حیا کا سودا کرنے چلی تھی مگر یہاں تو پوری عورت ہی بکاؤ سمجھی جاتی ہے! پتہ نہیں کتنی بار میرے سراپے کی قیمتیں لگ چکی ہوں گی اور میں لاعلم تھی۔ میں روشنیوں کے پیچھے ذلت کی اندھی کھائیوں سے بے خبر تھی۔

میرے اندر پاکیزہ تربیت کی چنگاری سلگ اٹھی اور میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس سے پہلے کہ میرا وجود تباہی و رسوائی کے گڑھے میں گرتا پروردگار کی رحمتوں نے مجھے بچا لیا، میرا ہاتھ تھام لیا اور بھیڑیوں کے چنگل سے بحفاظت نکل آئی۔

میں نے غلطی ضرور کی تھی مگر میرا دامن داغ دار نہیں ہوا

۔میں نے اپنی متاع لٹنے نہیں دی ورنہ زمانے میں بہت سے لٹیرے ایسی قیمتی متاعوں کی تاک میں ہوتے ہیں اور روشنیوں کے پیچھے اندھادھند بھاگنے والی مجھ جیسی بہت سی نادان لڑکیاں ان اُچکوں سے ناواقف ہوتی ہیں۔

آج گھر کے بوسیدہ در و دیوار ہرگز برے نہیں لگے۔ یہ بے روغن دیواریں کمزور نہیں تھیں جنہوں نے اٹھارہ برس میری عفت سمیٹے رکھی بلکہ درحقیقت میرا نفس کمزور تھا جس نے ماری خواہشات کی تکمیل کے لئے مجھے سراب کے راستے پہ ڈال دیا۔

میں اماں کی گود میں سر رکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ماں کی نرم آغوش اور باپ کی پرشفقت بانہیں بیٹی کا کتنا عظیم سائبان ہوتی ہی یہ میں نے آج جانا تھا۔ جو بیٹیاں اس سائبان کی لاج رکھتی ہیں، وہی عزت دار کہلاتی ہیں۔

آنسوؤں کی زبان نے سب کچھ بیان کر دیا تھا۔اماں نے میرے بال سمیٹ کر دوپٹہ سر پہ اوڑھا دیا اور اب مجھے سمجھ آیا وہ اتنے لمبے سجدے کیوں کرتی ہیں ۔ میں ان کی دعاؤں کا مرکز تھی اور آج اللہ نے ان کے سجدوں کی لاج رکھ لی تھی ۔میری حفاظت کی صورت میں ! میں بھٹکی ضرور تھی مگر اتنا دور نہیں گئی کہ پلٹنا ممکن نہ ہو سکے۔

اور اس رات کے بعد مجھے کسی بھی رات اندھیروں سے خوف نہیں آیا۔ کیونکہ میں ہدایت کا اجالا پا چکی تھی اور مجھے رات کے اندھیرے میں تیسرے پہر پروردگار کے آگے جھکنا بے حد اچھا لگتا ہے.....

☆☆☆

وحشی

''آ گئی۔'' ہجوم میں سے کوئی بولا اور سب لوگ یوں دو دو قدم آگے بڑھ گئے جیسے دو دو قدم پیچھے کھڑے رہتے تو کسی غار میں گر جاتے۔

''کتنے نمبر والی ہے؟'' ہجوم کے پیچھے سے ایک بڑھیا نے پوچھا۔

''پانچ نمبر ہے۔'' بڑھیا کے عقب سے ایک پنواڑی بولا۔

اور بڑھیا ہڑ بڑا کر ہجوم کو چیرتی ہوئی یوں آگے بڑھنے لگی کہ سب لوگ بس کے بجائے بڑھیا کو دیکھنے لگے۔

''عجیب وحشی عورت ہے۔'' ایک شخص نے اپنی ٹھوڑی سہلاتے ہوئے کہا۔''لے کے جبڑا توڑ ڈالا۔''

'ابے پاگل ہوئی ہے کیا؟'' ایک اور نے فریاد کی۔

اتنے میں بس آ گئی۔ کنڈ یکٹر نے کھڑاک سے دروازہ کھولتے ہوئے کہا''پہلے عورتیں۔''

ہجوم کے وسط میں پہنچی ہوئی بڑھیا رک گئی اور ہجوم نے بڑی ناگواری سے دو حصوں میں بٹ کر اسے راستہ دے دیا۔

بڑھیا نے سر پر سے چادر اٹھا کر، بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ پھر چادر کے ایک پلو کو مٹھی میں پکڑ لیا اور دور ویہ ہجوم پر فاتحانہ نظر ڈال کر، کنڈ یکٹر سے کہنے لگی۔''تیری ماں نے تجھے بسم اللہ پڑھ کر جنا ہے لڑکے۔''

''چل آ بھی مائی۔'' کنڈ یکٹر نے شرما کر کہا۔

''رستہ تو میں ویسے بھی بنا لیتی۔ آدھا تو بنا بھی لیا تھا پر تو نے جو بات کہی ہے وہ ہزار روپے کی ہے۔'' بڑھیا نے بس کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی وہ دوسری سیڑھی کو ہاتھ سے جکڑ کر بیٹھ گئی جیسے بہت بلندی پر پہنچ کر چکرا گئی ہے۔ کنڈ یکٹر نے اسے تھام لیا۔ ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور دروازے کے سامنے ہی ایک سیٹ پر بٹھا دیا۔ پھر سب لوگ بس میں بھر دیئے گئے اور اس ریلے میں کنڈ یکٹر بس کے پرلے سرے پر پہنچ گیا۔

بڑھیا نے ذرا سا اٹھ کر، سیٹ کو ہاتھ سے ایک دو بار دبایا اور آہستہ سے بولی۔

''بڑی نرم ہے۔'' بس چلی تو اس نے دائیں طرف دیکھا۔ ایک گوری چٹی عورت، دودھیا رنگ کی صاف ستھری ساڑھی پہنے، سنہری فریم کی عینک لگائے، سفید چمڑے کا پرس ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی اور کھڑکی سے باہر دیکھے جا رہی تھی۔

بڑھیا نے بھی گردن کو ذرا سا کھینچ کر باہر دیکھا۔ ہر چیز پیچھے کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ وہ آنکھیں مل کر سامنے دیکھنے لگی، پل بھر بعد اس نے گوری چٹی عورت کی طرف دوبارہ دیکھا۔ پھر اپنی انگشت شہادت اس کے گھٹنے پر بجا

دی۔عورت نے بھنویں سکیڑ کر بڑھیا کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔''چکر آ جائے گا باہر مت دیکھو۔''

گوری چٹی عورت مسکرائی اور بولی۔''مجھے چکر نہیں آتا۔''

''مجھے تو آ گیا تھا۔''بڑھیا بولی۔

''تمہیں آ گیا تھا تو تم باہر مت دیکھو، مجھے نہیں آتا اس لئے میں تو دیکھوں گی۔''

عورت نے کہا اور بڑھیا نے پوچھا۔''تو کیا تم باہر نہیں دیکھو گی تو تمہیں چکر آ جائے گا؟''

عورت کی مسکراہٹ یکا یک غائب ہو گئی اور وہ باہر دیکھنے لگی۔

بڑھیا کو اگلی سیٹ پر ایک عورت کا صرف سر نظر آ رہا تھا، اس نے بالوں میں زرد رنگ کا ایک پھول سجا رکھا تھا۔ بڑھیا نے ذرا سا آگے جھک کر پھول کو غور سے دیکھا، پھر انگلی سے اپنی ہمسائی کا گھٹنا بجا کر بڑی راز داری سے بولی۔''یہ پھول اصلی ہے کہ نقلی؟''

''نقلی ہے؟''عورت بولی۔

''نقلی ہے تو سونے کا ہوگا۔''بڑھیا نے رائے ظاہر کی

۔

''مجھے تو اصلی لگتا ہے کسی جھاڑی سے اتارا ہے۔''

بڑھیا بولی۔

''تو پھر اصلی ہوگا۔''عورت نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

بڑھیا نے ذرا سا حیران ہو کر گوری چٹی عورت کی طرف دیکھا اور پھر انگلی سے اس کا گھٹنا بجا دیا۔

''کیا ہے؟''عورت نے بھنویں سکیڑ کر پوچھا۔

بڑھیا بولی۔''عجیب بات ہے۔باہر تم دیکھتی ہو اور چکر مجھے آ جاتا ہے۔''

عورت ذرا سا مسکرائی۔

''سنو!''بڑھیا نے کہا۔

''کیا ہے؟''عورت نے پھر سے بھنویں سکیڑ لیں۔

''لیڈی ہو؟''بڑھیا نے سوال کیا

''کیا؟''عورت نے جیسے برا مان کر پوچھا۔

''ہسپتال کی لیڈی ہو؟''بڑھیا نے وضاحت کی۔

''نہیں!''عورت بولی۔

''تو پھر کیا ہو؟''

''کیا؟''

''کیا کرتی ہو؟''

''کچھ نہیں کرتی۔''

''کچھ تو ضرور کرتی ہو۔''بڑھیا نے دائیں بائیں سر ہلا کر کہا۔

''ٹکٹ لے لو مائی۔''بڑھیا کو اپنے سر کے اوپر سے کنڈیکٹر کی آواز سنائی دی۔

''دے دو۔''بڑھیا نے چادر کے پلو کو مٹھی سے آزاد کر دیا۔

''کہاں جاؤ گی؟''کنڈیکٹر نے پوچھا۔

''گھر جاؤں گی بیٹا!''بڑھیا بڑے پیار سے بولی۔

کنڈیکٹر زور سے ہنسا۔گوری چٹی عورت بھی بڑھیا کی

طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔

کنڈ یکٹر نے جیسے تمام مسافروں کو مخاطب کر کے کہا ۔''میں نے مائی سے پوچھا کہاں جاؤ گی ۔ بولی ۔گھر جاؤں گی ۔''اب کے مسافروں نے بھی کنڈ یکٹر کے قہقہے کا ساتھ دیا۔

کنڈ یکٹر بہت محظوظ ہوا تھا اس لئے بڑھیا کو بڑی نرمی سے سمجھاتے ہوئے بولا۔''گھر تو سب لوگ جائیں گے مائی ۔یہ بتاؤ۔میں کہاں کا ٹکٹ کاٹوں ۔''

''والٹن کا۔'' وہ بولی ۔''میرا گھر والٹن کے پار ایک گاؤں میں ہے۔''

مسکراتے ہوئے کنڈ یکٹر نے ٹکٹ کاٹ کر بڑھیا کو دیا اور بولا۔''ساڑھے پانچ آنے دے دو۔''

''ساڑھے پانچ آنے ؟'' بڑھیا نے چادر کے پلو کی گرہ کھولتے ہوئے پوچھا۔''ساڑھے پانچ آنے کیسے؟ غوثا کہہ رہا تھا صرف چار آنے لگتے ہیں ۔اس نے تو مجھے صرف یہ گول مول چونی ہی دی ہے ۔''اس نے چونی دو انگلیوں کی پوروں میں تھام کر کنڈ یکٹر کی طرف بڑھا دی۔

کنڈ یکٹر بولا۔''نہیں مائی ۔چار آنے نہیں ۔ساڑھے پانچ آنے لگتے ہیں ۔''

بڑھیا کی آواز تیز ہوگئی ۔''ساری دنیا کے چار آنے لگتے ہیں ۔میرے ساڑھے پانچ آنے لگ گئے ؟ کیوں ؟ ہڈیوں کا تو ڈھیر ہوں ۔میرا بوجھ ہی کیا۔لے یہ چار آنے ۔''

''عجیب مصیبت ہے ۔'' کنڈ یکٹر کے تیور بدل گئے اور وہ مسافروں کو سامعین بنا کر تقریر کرنے لگا۔''میں تو کہتا ہوں کہ سرکار کو قانون پاس کرنا چاہیے کہ جو پرائمری پاس نہ ہو، بس میں سفر نہ کرے ۔اب اس مائی کو دیکھئے میو ہسپتال کے سٹینڈ پر بس میں بیٹھی ہے ۔والٹن جا رہی ہے اور کہتی ہے والٹن بھی جاؤں گی اور ساڑھے پانچ آنے بھی نہیں دوں گی ۔اس لئے کہ کسی نے اسے چار آنے دیئے ہیں ۔''

بڑھیا بچے کی طرح بولی ۔''کسی نے کیوں ؟ اپنے غوثے نے دیئے ہیں ۔''

کنڈ یکٹر نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے اور اب کے مسکراتے ہوئے کہا۔''اس لئے کہ غوثے نے اسے صرف چار آنے دیئے ہیں ۔اب اسے کون سمجھائے کہ بس سرکاری کی ہے غوثے کی نہیں ہے،غوثے کی ہوتی تو وہ تم سے چار ہی آنے لیتا۔''

''کیوں، وہ کیوں لیتا چار آنے ؟'' بڑھیا بولی ۔''وہ تو میرا بھتیجا لگتا ہے ۔کماؤ ہے روز اپنے ریڑھے پر دودھ لاتا ہے ۔آج میں اسی کے ریڑھے پر تو آئی تھی ۔چار آنے چھوڑ چار پیسے بھی نہیں مانگے ۔ اس کی مجال تھی جو مانگتا۔گود میں کھلایا ہے ۔اس کی سالی یہاں ہسپتال میں بیمار پڑی ہے ۔ میں نے کہا چلو ، اسے دیکھ لوں ۔ اسی ریڑھے پر واپس آجاؤں گی ۔مگر آج لڑکی کی حالت اچھی نہیں ہے اس لئے غوثا یہیں رہ گیا ہے اور مجھے یہ چونی دے کر کہا ہے کہ گھر چلی جاؤں ۔اب تم ساڑھے پانچ آنے مانگ رہے ہو تو یوں کرو مجھے کسی چار آنے والی جگہ پر بٹھا دو ۔ میں تو کسان عورت ہوں، نیچے بھی بیٹھ جاؤں گی ۔تم کہیں اس نرم نرم گدے کے تو ساڑھے پانچ آنے نہیں مانگ رہے؟''

''نہیں مائی۔'' کنڈیکٹر نے تنگ آ کر کہا، ''سب سواریوں کے نیچے ایسے ہی گدے ہیں۔''

بڑھیا نے حیران ہو کر پوچھا۔''تو پھر میں کیا کروں؟''

''ڈیڑھ آنہ اور نکالو۔'' کنڈیکٹر بولا۔

''کہاں سے نکالوں؟'' وہ بولی۔''بتا جو رہی ہوں کہ میں گھر سے خالی ہاتھ آئی تھی۔ یہ چونی بھی غونثے نے دی ہے۔کل اسے لوٹا دوں گی۔''

کنڈیکٹر صاف طور سے اپنے غصے پر ضبط کر رہا تھا۔

''مجھے تو آج ہی چاہیے مائی، میں تو ٹکٹ کاٹ چکا ہوں۔ جلدی کرو۔اتنے بہت سے اسٹینڈ گزر چکے ہیں،اتنی بہت سی سواریاں جمع ہو گئی ہیں۔سب کے ٹکٹ کاٹنے ہیں۔کوئی چیکر آ گیا تو جان آفت میں کر دے گا۔بھئی لوگو خدا کے لئے اس مائی کو سمجھاؤ۔جانا والٹن ہے اور کرایہ ماڈل ٹاؤن کا بھی نہیں دے رہی ہے۔ پھر کہتی ہے چونی سے زیادہ ایک کوڑی بھی نہیں ہے۔''

بڑھیا کے سامنے والی سیٹ پر، بالوں میں پھول سجا کر بیٹھی ہوئی عورت نے پلٹ کر کہا۔''ایسیوں کی تلاشی لینی چاہیے۔ان کی جیبیں اکنیوں دونیوں سے بھری ہوتی ہیں۔''

بڑھیا اس کے سر کے اوپر چیخ اٹھی۔''کیا تو میرے بیٹے کی گھر والی ہے کہ تجھے میری جیبوں کا حال بھی معلوم ہے۔سر میں دو کوڑی کا پھول لگا لینے سے بھیجے میں عقل نہیں بھر جاتی بی بی رانی!۔''

پھول والی عورت دانت کچکچا کر رہ گئی۔

گوری چٹی عورت نے بڑھیا کا بازو پکڑ کر اسے سیٹ کی طرف کھینچا اور بڑھیا بیٹھ گئی۔

''عجیب وحشی عورت ہے'' کسی کی آواز آئی۔

''یہ کون بولا؟'' بڑھیا نے پلٹ کر بس کے آخری سرے تک نظریں دوڑائیں۔

''ذرا ایک بار پھر بولے کہ میں اس کی زبان یوں لمبی کھینچ کر کھڑکی سے باہر پھینک دوں۔''

گوری چٹی عورت کو جھرجھری سی آ گئی اور وہ یوں سمٹ گئی جیسے بڑھیا نے سچ مچ لٹکتی ہوئی اور خون ٹپکاتی ہوئی زبان اس کے اوپر سے گزار کر کھڑکی سے باہر اچھال دی ہے۔

''دیکھ مائی۔'' کنڈیکٹر جو اس دوران میں دوسرے مسافروں کے ٹکٹ کاٹنے لگا تھا اُس کے قریب آ کر سختی سے بولا۔

''ساڑھے پانچ آنے دے گی یا نہیں؟''

''تو تو تھانیداروں کی طرح بولنے لگا لڑکے۔ کہہ جو رہی ہوں کہ چونی یہ رہی۔ باقی رہے چھ پیسے تو وہ میں تجھے پہنچا دوں گی۔کل والٹن میں آ کر بیٹھ جاؤں گی،اور تو آئے گا تو تیرے ہاتھ پر رکھ دوں گی۔کھرے کر لینا۔''

''لو اور سنو۔'' کنڈیکٹر نے سب مسافروں سے فریاد کی۔

پھر یکایک اس کے تنے ہوئے تیور ڈھیلے پڑنے لگے اور وہ ایک سفید پوش بزرگ کے پاس جا کر جھک گیا۔

بڑھیا نے انگلی سے گوری چٹی عورت کا گھٹنا بجایا اور جب عورت نے اس کی طرف دیکھا تو بڑھیا بولی۔''دیکھ رہی ہو؟'' عورت نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔'' لگتے تو مائی

ساڑھے پانچ ہی آنے ہیں، پھر یہ بس سرکاری ہے۔ یہ لڑکا سرکار کا نوکر ہے۔ ایک آنہ بھی کسی سے کم لے تو یا اپنی جیب سے ڈالے گا یا نوکری چھوٹ جائے گی غریب کی۔''

''ہے ہے بے چارا۔'' بڑھیا نے پیار سے کنڈ یکٹر کی طرف دیکھا۔''میں نے تو عمر بھر اپنا رزق اپنے ہاتھوں سے کمایا ہے۔ میں کیوں کسی کے رزق پر ڈاکہ ڈالوں چھ پیسوں کے پیچھے، مجھے کیا خبر تھی، وہ غوثا ہی دھوکا دے گیا۔ پر اسے کیا پتہ، وہ بیچارا بھی تو ریڑھے پر لاہور آتا ہے، اب کیا کروں ؟''

''یوں کرو۔'' گوری چٹی عورت نے اپنا پرس کھولتے ہوئے کہا۔''میں تمہیں.....''

اتنے میں کنڈ یکٹر آ گیا۔ بڑھیا بولی۔''بھئی لڑکے! مجھے تو خبر نہیں تھی کہ اس طرح.....''

کنڈ یکٹر بولا۔''بس مائی۔ اب سارا حساب ٹھیک ہو گیا ہے۔ تجھے والٹن پر ہی اتاروں گا۔''

بڑھیا کھل گئی۔''میں نے کہا تھا نا کہ تیری ماں نے تجھے بسم اللہ پڑھ کر جنا ہے۔ پر یہ بتا لڑکے چونی ہی پر راضی ہو جانا تھا تو ساڑھے پانچ آنے کا جھگڑا کیوں چلایا؟''

''حساب تو مائی ساڑھے پانچ ہی آنے سے پورا ہوا ہے۔'' کنڈ یکٹر بولا۔

''تو میں چھ پیسے کہاں سے لاؤں؟'' بڑھیا پھر اداس ہو گئی۔

''چھ پیسے مجھے مل گئے۔'' وہ بولا۔

''کہاں سے ملے؟'' بڑھیا نے پوچھا۔

''اس چودھری نے دیئے ہیں۔'' کنڈ یکٹر نے سفید پوش بزرگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں دیئے ہیں؟'' بڑھیا نے حیران ہو کر پوچھا۔

کنڈ یکٹر بولا۔''ترس کھا کر دے دیئے۔''

بڑھا اٹھنے کی کوشش میں سیٹ پر گر پڑی۔ کس پر ترس کھایا؟'' وہ چلائی۔

''تم پر اور کس پر۔'' کنڈ یکٹر بولا۔

بڑھیا بھڑک اٹھی اور چیخ کر بولی۔''ذرا میں بھی تو دیکھوں اپنے ترس کھانے والے کو۔''

گوری چٹی عورت فوراً پرس بند کر کے بڑھیا کی طرف دیکھنے لگی۔

بڑھیا چھت کی راڈ اور سیٹوں کی پشتوں کے سہارے سفید پوش بزرگ کی طرف جانے لگی۔''یہ چھ پیسے کیا تیری جیب میں بہت کُود رہے تھے کہ تو نے ترس کھا کر میری طرف یوں پھینک دیئے جیسے کتے کی طرف ہڈی پھینکی جاتی ہے۔''

''لیجے، یہ ہے بھلائی کا زمانہ۔'' کوئی بولا۔

سفید پوش بزرگ کا رنگ مٹی کا سا ہو گیا اور بڑھیا بولتی رہی۔''ارے سخی داتا کہیں کے، تو مجھ پر ترس کھاتا ہے جس نے ساٹھ ستر سال دھرتی میں بیج ڈال کر پودوں کے اُگنے اور خوشوں کے پکنے کے انتظار میں کاٹ دیئے ہیں، تو ان ہاتھوں پر چھ پیسے رکھ رہا ہے جنہوں نے اتنی مٹی کھودی ہے کہ اکٹھی ہو تو پہاڑ بن جائے اور تو مجھ پر ترس کھاتا ہے؟ کیا تیرے کوئی ماں بہن نہیں ہے ترس کھانے کے لئے؟ کوئی اندھا فقیر نہیں ملا تجھے رستے میں؟ شرم نہیں آتی تجھے ایک

کسان عورت پر ترس کھاتے ہوئے۔''

پھر وہ کنڈیکٹر کی طرف پلٹی۔'' یہ چھ پیسے جو اس نے مجھ پر تھوکے ہیں۔اسے واپس دے دے،اور مجھے یہیں اتار دے۔میں پیدل چلی جاؤں گی۔ مجھے پیدل چلنا آتا ہے۔''

بڑھیا خاموش ہوگئی۔بس میں صرف بس چلنے کی آواز آرہی تھی۔

بس ایک لمحہ بعد سٹینڈ پر رکی تو بڑھیا سیڑھیوں کی پروا کیے بغیر دروازے میں سے لٹکی اور باہر سڑک پر ڈھیر ہوگئی۔ پھر وہ اٹھی ، کپڑے جھاڑے اور ناقابل یقین تیزی سے والٹن کی طرف جانے لگی۔بس میں سے کسی کی آواز آئی۔ ''عجیب وحشی عورت ہے!''

☆☆☆

درد وچھوڑے دا

یہ دنیا کتنی خالی ہوگئی ہے میرے دل کی طرح اور کبھی لگتا ہے کائنات میں یادیں ہی یادیں سمائی ہوئی ہیں میری ماں کی یادیں جیسے میرے دل میں.....ایک تڑپتی تحریر

میرے اور میری ماں کے درمیان انتظار کا رشتہ تھا۔ وہ انتظار جو محبت کی آگ کو مزید بھڑکا دیتا ہے۔ دروازے کے پٹ سے لگی میرا انتظار کرتی میری پیاری ماں!۔

میری یاد داشت میں ماں کی منتظر نگاہوں کا پہلا تاثر بہت پُرانا ہے۔ ہماری ایک رشتہ دار خاتون ''روشنی مرحومہ'' کی بہت سی اولادیں فوت ہوئیں۔ ان میں فوت شدہ ایک بیٹی میری ہم عمر تھی۔ وہ مجھے اپنے گھر لے جاتیں۔ اُس دن بھی وہ میری انگلی پکڑے گلی میں نکلیں تو میری ماں دروازے کی اوٹ سے مجھے جاتا دیکھ رہی تھیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا ۔منتظر نگاہیں.....''بیٹی کب آؤ گی؟''.....''جلدی آجانا۔''

پھر یہ سوال کرتی نگاہیں میری ساری زندگی پر محیط ہو گئیں۔ میرا سکول کا پہلا دن، میری ماں دروازے کا پٹ پکڑے مجھے رخصت کر رہی تھی .....محبت بھرا وہ شفیق چہرہ، ویسے ہی گلی میں نگاہیں جمائے ملا جب میں واپس آئی۔ مجھے لگا.....صبح سے میری ماں اسی طرح پٹ پکڑے میرے انتظار میں کھڑی تھی۔ جُوں جُوں اس دنیا سے اُن کے رخصت ہونے کا عرصہ طویل ہو رہا ہے، ان کی محبت بھرے انتظار کا احساس بھی گہرا ہو جاتا جا رہا ہے۔ ہر اولاد سے والہانہ پیار ماں کا خاصہ ہے۔ مگر جو بچہ جدائی اور دور ہونے کے احساس سے منسلک ہو، اس کے ساتھ انداز محبت بھی جدا ہو جاتا ہے ۔

مڈل سکول کے بعد تعلیم کے سلسلہ میں پہلے بہاول پور۔ پھر لاہور اور فیصل آباد رخصت کرنا.....اور ان سے بلکہ سب سے رخصت ہونا میرے لئے ایک آزمائش کا وقت ہوتا تھا۔ اور یہ آزمائش ہر چار چھ مہینے بعد ضرور آجاتی تھی۔ اور آج تک قائم ہے۔ اور پھر میرے خط کے انتظار میں ..... ڈاکئے کے آنے کا وقت ..... خط مجھے روانہ کرتیں اندازہ لگاتیں کہ کتنے دنوں میں پہنچے گا؟ اور اندازاً کتنے دنوں میں جواب آجانا چاہیے۔ اور پھر وہی ان کا منتظر نگاہوں سے بیٹھک کے جالی والے دروازے سے لگ جانا ..... ڈاکئے کے انتظار میں.....

میکہ سے رخصتی.....اور پھر پاکستان سے رخصتی میرے کراچی جانے کے لئے ریلوے اسٹیشن پر جو حالت میری ماں کی تھی وہ مجھے یاد آتی ہے تو کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے سے لگا کر میرے وجود کو محسوس کر رہی تھیں، میں سخت ہراساں ہوئی جا رہی تھی۔ مجھے بالکل سمجھ نہیں آرہی تھی میں کیا کروں۔ ضبطِ گریہ سے میرا دل پھٹنے کو تھا۔ میرا رونا دیکھ کر ان کی حالت مزید خراب ہو جاتی۔ اُس وقت مجھے ان کے جذبات کا ادراک اس طرح نہ ہوا .....مگر جب میں نے اپنی

بیٹی کو پردیس روانہ کیا تو مجھے لگا میری ماں میرے اندر سما گئی ہے اور میں ان کی تڑپ کو محسوس کر رہی ہوں ۔انسان کی سرشت ہے کہ جب تک وہ اسی مقام پہ نہ آجائے اس کی فہم اُس کا ساتھ نہیں دیتی۔ایک بار چھٹیوں کے بعد لاہور جاتے ہوئے وادعی کے وقت میں رونے لگی .....تو خط لکھا کہ جب تک تم واپس نہیں آتی ، مجھے تمہارا روتا چہرہ ہی نظر آتا رہے گا .....اور میں نے اس کے بعد رخصتی کے وقت ضبطِ گریہ کی مشق کر لی ۔مگر یہ بہت ہی سخت آزمائش ہے ۔ جو اپنوں سے الوادعی ملاقات کرتے ہوئے آج بھی میرے مقدر میں ہے۔

ریلوے اسٹیشن پہ جب تک گاڑی کے انتظار میں بیٹھے رہے۔وہ میرے وجود کے لمس کو محسوس کرتی رہیں۔کبھی ہاتھ دباتیں ۔ چہرے پر ہاتھ پھیرتیں ، میرا ہاتھ اپنی قمیض کے اندر سینے پر رکھ کر محسوس کرتیں ، ماتھا چومتیں ، جانے ان کے دل میں کیا خدشات ابھر رہے ہوں گے ۔جانے کب ملنا ہو؟ .....آنکھوں میں مکہ، مدینہ جانے کا تفاخر۔اور جدائی کا نوحہ ،مل جل کر کیا کچھ نہیں پیش کر رہے تھے ،کوئی الفاظ نہیں ہیں .....کوئی جملہ نہیں ہے جو اس جذبے کو نام دے سکے۔وہ لمحے مجھے اب وقت گزرنے کے ساتھ زیادہ شدت سے محسوس ہونے لگے ہیں ۔ باہم رابطے کی آج کے دنوں کی مانند آسانیاں ایجاد نہ ہوئی تھیں ۔ایک خط پندرہ دن میں پہنچتا پھر پندرہ دن جواب آنے میں لگتے اس طرح چالیس دنوں کا اندازہ لگا کر بے قرار نگاہیں دروازے پر ٹک جاتیں اور کان ڈاکیئے کی آواز کے لئے جم جاتے ۔اُس دن جب ریل گاڑی میں بیٹھ گئی تو ساتھ بیٹھی رہیں ۔ کندھوں پر دست شفقت پھیرتی دعائیں دیتی میری ماں اس وقت بھی مجھے ان کے ہاتھوں کا لمس محسوس ہو رہا ہے ۔گاڑی کی وسل ہوئی تو نیچے اتر آئیں مگر کھڑکی کے پاس آکر میرے ہاتھ کو پکڑا ہونٹوں پہ لگایا اور آنکھوں میں وہی انداز .....جس کا کوئی نام نہیں ۔میری خواہش ہوئی کہ میں کھڑکی سے باہر کود جاؤں .....گاڑی چل پڑی اور میری ماں ریلوے اسٹیشن کے فٹ پاتھ پہ کھڑی رہ گئی .....ان کی منتظر نگاہیں میرے دل میں پیوست ہو گئیں ''بیٹی کب ملو گی ؟''''جلدی آجانا'' ۔ میں کہیں بھی جاتی ''جلدی آجانا'' کہنا نہ بھولتیں ۔وہ سب یاد کر کے اور اب لکھتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونا آسان ہے گزرتے وقت کے ان لمحوں کو گرفت میں لانا مشکل ہے..... بلکہ ناممکن ہے۔جب تک میرا نیا خط نہ آجاتا، پرانے خط کو ہی بار بار پڑھتی رہتیں ۔سب کو پڑھواتیں ۔ان کا دل چاہتا تھا کہ سب وہی کچھ محسوس کریں جو وہ اپنی بیٹی کے لئے محسوس کرتی ہیں۔

جب نواسی کو رخصت کرنے ائیر پورٹ گئیں تو اُس کی جدائی کو محسوس کرنے کا انداز بھی میری محبت اور میرا اپنی بیٹی سے احساس جدائی سے جڑا ہوا تھا..... کہنے لگیں ''مجھے معلوم ہے آج تم کیا محسوس کر رہی ہو''.....اور میرے احساس کا احساس ان کو رُلانے لگا۔

میری بیٹی کو رخصت کرتے وقت نصیحت کی ''اگر تمہیں کوئی پریشانی ہو تو اپنی ماں کو نہ بتانا اُس کو تکلیف ہو گی ..... نانی کو بتانا یہ بات بیٹی نے بعد میں بتائی میری تکلیف کا اس قدر احساس تھا ان کو..... بھلا اس محبت شفقت کا کوئی جواب

یا صلہ ہوسکتا ہے؟ وہ میری پیاری ماں کے انمول جذبے..... آہ!! اتنی بڑی کائنات میں کوئی ان جیسا نہیں ہے۔ یہ دنیا کتنی خالی ہوگئی ہے میرے دل کی طرح اور کبھی لگتا ہے کائنات میں یادیں ہی یادیں سمائی ہوئی ہیں..... میری ماں کی یادیں جیسے میرے دل میں.....ہم کوشش بھی کریں تو اپنی اولادوں کے لئے ایسی ماں نہیں بن سکتے۔

میرے سارے خط سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ ترتیب وار۔ میری استعمال شدہ ہر چیز سنبھال کر رکھتیں۔ میں اپنا کوئی جوڑا رکھ جاتی تو اس کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہتیں۔ نیا سوٹ لے کر خوش نہ ہوتیں۔ استعمال شدہ لے کر کہتیں ''اس میں سے تمہاری خوشبو آتی ہے لگتا ہے تم سینے سے لگی ہوئی ہو۔''

میری تحریروں کے شائع ہونے پر بے انتہا خوش ہوتیں اور جب کوئی پڑھ کر تعریف کرتا تو مزید خوش ہوتیں۔ بچپن میں بھی انعام دیتیں۔ ابھی گزشتہ دنوں چھوٹی بہن عیشہ راضیہ نے مجھے فون کیا ''باجی! امی آپ کو انعام دیا کرتی تھیں۔ اب میں آپ کو انعام دوں گی۔'' تو مجھے اتنا لطف آیا اس کی بات سن کر امی جان کے لئے، اور عیشہ کو ان کے لئے صدقہ جاریہ بننے پہ بہت دعائیں کیں۔ امی کی شباہت عیشہ میں نمایاں ہوتی جارہی ہے میری اُس سے محبت بھی بڑھتی جارہی ہے ہم خیال کرتے ہیں کہ والدین خصوصاً ماں کے لئے ہم بھی محبت کا جذبہ رکھتے ہیں اور بھلا برا جو کچھ بھی کرتے ہیں بس کافی ہے۔ مگر ان کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد ادراک ہوتا ہے کہ ہم نے سوائے حسرتوں کے کچھ نہیں پایا..... خالی ہاتھ اور خالی دامن..... ماں کی محبت کا نہ کوئی بدل ہے نہ بدلہ..... اپنی ڈائری میں جہاں کہیں میرا یا کسی بھی اولاد کا نام لکھا یا کوئی ذکر کیا ہے تو ساتھ بریکٹ میں (اللہ حافظ و ناصر) ضرور لکھا ہے اور یہ کہ بڑی بیٹی تو سہیلی کی طرح ہوتی ہے۔ سال بھر انتظار کے بعد سعودیہ سے آنا ہوتا تو جہانیاں میں گزارنے کے لئے چند دن ہی نصیب ہوتے۔ جب بھی ماں کے گھر سے رخصت ہوتی تو میری کوشش ہوتی کہ دروازے سے نکلوں تو جلدی سے نظروں سے اوجھل ہو جاؤں تاکہ وقتِ رخصتی کا ضبط گریہ زیادہ آزمائش سے نہ گزرے۔ میری ماں کی خواہش ہوتی کہ دائیں طرف سے جایا کروں۔ ادھر سے گلی کا راستہ لمبا ہے ''میں زیادہ دیر تک تمہیں دیکھ سکتی ہوں''..... دونوں طرف ایک ہی جذبہ ہے لیکن اظہار کا طریقہ مختلف ہے۔ دنیا کی ہر ماں اپنی ذات پہ تکالیف جسمانی ہوں یا قلبی برداشت کر لیتی ہے۔ یہ وہ حصار ہے جس سے ہر اولاد فائدہ اٹھاتی ہے۔ اپنوں، غیروں کی طرف سے چلائے ہوئے حسد، رقابت کے تیر، مٹی، دھول، کیچڑ کے چھینٹے مائیں کتنی سہولت سے اپنے اوپر برداشت کرتی ہیں اور اولادوں کو ان کی خبر بھی نہیں ہونے دیتیں۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ جب حالات خود ہی اُس کو آشکار کر دیں تو اولاد دم بخود رہ جاتی ہے۔

ہر ماں عظیم، اور ہر بیٹی کی ماں عظیم تر ہے۔ ماں کو بیٹی میں اپنا وجود پھلتا پھولتا نظر آتا ہے اور بیٹی کو ماں کی صورت میں ایک آسرا نظر آتا ہے۔ زندگی کی مشکلات میں ہاتھ پکڑنے والی اس ہی جیسی ایک اور ہستی۔ جس کے وجود کا وہ خود حصہ ہے۔ اپنے وجود کا حصہ پاس نہ ہو تو ماں کی کیفیت نا

قابل بیان ہے جب تک میں ''بیٹی'' رہی ۔ میں اپنی جدائی کے احساس کو ''بیٹی'' بن کر ہی سوچتی رہی ۔ ماں سے جدا ہونا۔ یہ غم مجھے لگتا بس میں ہی محسوس کرسکتی ہوں جب بیٹی کو رخصت کر کے میں ''ماں'' بنی تو میرے اندر دو جدائیوں کے غم پرورش پانے لگے .....'' ہائے ! میری ماں نے میری جدائی کیسے برداشت کی ہوگی ۔ وہ تو مجھ سے محبت نہیں عشق کرتی تھیں'' وہ تو میری جدائی کا غم اور انتظار کے کرب میں اُس وقت سے مبتلا تھیں جب میں چودہ سال کی تھی ۔

مجھے سعودیہ آئے ایک سال ہوا تو حج کی سعادت حاصل کرنے آئیں۔ان دنوں ابھی ہمارے کمپنی کے حالات سیٹ نہ ہوئے تھے ۔ بہت آزردہ ہوئیں ، پھر میں بیمار پڑ گئی ۔ میں نے کیا ان کی خدمت کرنا تھی ۔ وہی میری تیمارداری اور گھر اور بچی کو سنبھالنے میں لگی رہتیں ۔

حرم شریف میں ہر جگہ، ہر لمحہ دعا کرتیں ۔کسی کو بہت خشوع وخضوع سے دعا کرتے یا گریہ کر کے دعا میں مصروف دیکھتیں تو اُسے کہتیں ''میری بیٹی کی صحت کے لئے دعا کر دیں'' مجھے ساتھ لے جاتیں اور بتاتیں اس کے لئے دعا کریں'' ان کی دعاؤں کے طفیل چند ہی دنوں بعد اللہ تعالیٰ نے سب حالات بہتر کر دیئے ۔ کمپنی کی طرف سے ہر آسائش اور صحت بھی اللہ تعالیٰ نے عطا کر دی ۔ حج کے ان دنوں کی ڈائری کے ہر ورق پہ ''میرے لئے دعا درج ہے ۔'' بچپن میں ایک بار ہم تینوں بڑے بہن بھائی بیمار ہو گئے ۔ پرانی ڈائری میں ان دنوں کے بارے میں ابا جان نے لکھا ہوا ہے ''یہ عام الحزن ہے میرے بچے بیمار ہیں''

جیسا میں محسوس کرتی ہوں ۔ میرے سب بہن بھائی یقیناً ایسی ہی محبت کا احساس دلوں میں رکھتے ہیں ۔ میرے توسط سے ان سب کے دلوں کا حال بھی اُجاگر ہو رہا ہے ۔ ہر بچہ والدین کے لئے خاص ہوتا ہے اور اپنی کسی نہ کسی خوبی کی بنا پر وہ ''اکلوتا'' ہی ہوتا ہے ۔ حج کرنے آئیں تو ہر بچے کا تذکرہ پوری تفصیل سے کرتی رہیں ۔ چھوٹی بچی جو کہ گود میں تھی ۔ بڑی بیٹیاں ، بیٹا ، دعا کا خاص انداز ۔ ہر مقام پہ کسی نہ کسی کے ساتھ کوئی نہ کوئی مناسبت نکل آتی ۔ سب کو اپنی محبتوں کے حصار میں رکھتی تھیں ۔ اپنی ماں کے ساتھ آخری دنوں کی ملاقات ، بس تین دن کا ساتھ .....سال بعد نصیب ہوا.....وفات سے ایک دن پہلے ناشتہ کرنے کے بعد کہنے لگیں ۔

''تم پردیسن کے ہاتھ کی روٹی میں نے پوری کھا لی ہے''.....محبت کا ایک اچھوتا سا احساس ان کے لہجے میں نمایاں تھا میں سوچتی رہی بھائی کی شادی کا ہنگامہ ختم ہو گا تو بہت ساری باتیں کرنا ہیں ۔

بیٹے واصف کے نکاح کے بعد بھی ہماری پہلی ملاقات تھی ۔ کہنے لگیں

''میں نے کسی کا واقعہ پڑھا تھا کہ انہوں نے اپنے بیٹے کا نکاح مسجد نبوی میں کیا تھا ۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میرے بھی کسی بچے کا نکاح اُس مقدس و بابرکت مقام پہ ہو '' واصف کا نکاح وہاں ہوا تو میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اُس نے میری خواہش پوری کر دی ۔''

اگلے دن میری ماں کو دنیا سے منہ موڑنے کا حکم دیا گیا اور انہوں نے سر اطاعت جھکا دیا ۔ میری گود میں ان کا وجود

تھا۔ میرے سینے سے ٹیک لگائے میری ماں چپکے سے چلی گئی ..... اتنی خاموشی سے کہ میرے اور ان کے درمیان کوئی فاصلہ نام کو بھی نہ تھا پھر بھی میں نے ان کے جانے کی آہٹ تک نہ سنی۔ چند سیکنڈ پہلے منہ میں دوا ڈالی تو خود منہ کھولا ..... چمچے سے لگی باقی دوا کو دیکھا تو دوبارہ منہ کھولا۔ ایک چمچہ منہ میں پانی ڈالا ..... اور پھر میرے بازو پہ سر رکھ دیا۔ اور یہی واپسی کا لمحہ تھا۔ میں نے محسوس کیا دل کی دھڑکن جو مجھے محسوس ہو رہی تھی اب ایک دم ختم ہو گئی ہے جیسے کوئی سوئچ آف کر دے..... میں نے پائنتی پہ بیٹھی حمیرا یاسمین کو احساس دلایا کہ ''دل کی دھڑکن نہیں ہے۔'' اور اس دھڑکن کا رکنا ہی ان کی زندگی کے دوسرے مقام پہ منتقل ہونا تھا (انا للہ وانا الیہ راجعون) انسان کو کیا معلوم کہ ان کے درمیان فرشتہ اجل موجود ہے۔ زندگی کی گہما گہمی سے کس طرح ایک جیتا جاگتا انسان بے نیاز کر دیا جاتا ہے۔ زندگی کی گاڑی کو ایک دھچکا لگتا ہے۔ پھر وہ رواں دواں ہو جاتی ہے۔ لیکن جو مسافر اتر جاتا ہے اس کی سنگت اور اس سے وابستہ رشتہ مسافروں کے دلوں سے محو نہیں ہوتا..... زندگی کی ریل گاڑی میں ہر مسافر اپنی منزل آنے پر اتر جاتا ہے۔ ہاتھ پکڑ کر فرشتہ اجل اُسے اتار دیتا ہے۔ ہر مسافر اس مگن اور دھن میں لگا ہوا ہوتا ہے کہ ابھی میری باری نہیں آئے گی لیکن کس کی باری کب آنی ہے ہر مسافر اس سے بے خبر ہے۔

ماں اپنی بیٹیوں کو رخصت کر کے انکی گڑیاں، کھلونے، کتابیں دیکھ کر دل بہلاتی ہے اور ان کی آسودگی کے لئے دعا گو رہتی ہے۔ ہم بیٹیوں نے ماں کو رخصت کیا تو ہم سب کے پاس یادیں ہی یادیں تھیں۔ ہر بیٹی کا اندازِ غم جدا تھا۔ جیسا کہ ماں کی محبت کا ہر بیٹی کے ساتھ انداز محبت جدا تھا۔ ہر کوئی ایک دوسرے میں ماں کی کوئی نہ کوئی نسبت تلاش کر کے ماں کی کمی پوری کرنے میں کوشاں ہے۔ اللہ رب العزت نے ماں کا نعم البدل کسی کو نہیں بنایا لیکن بہنیں ماں کا عکس ہی ہوتی ہیں۔ اُسی وجود کا حصہ ..... کیسی زنجیریں ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ رشتوں میں جکڑی ہوئی ہیں اور انہی زنجیروں نے احساسات و جذبات کو منتقل کرنے کا فریضہ انجام دینا ہوتا ہے۔

ماں کی رخصتی کے بعد ان کی سنبھالی ہوئی یادگار خاص اشیاء، خط، ڈائریاں وغیرہ دیکھ رہے تھے تو حمیرا یاسمین نے مجھے ایک چھوٹی سی چیز پکڑائی جو کاغذ میں لپٹی ہوئی تھی..... جس کو دیکھ کر دل رنجور نے ایک آہ بھری..... اور اپنی ماں کی محبت کے انمول ہونے کی مزید تصدیق کی ..... وہ بھلا کیا تھا ؟..... چند بال جیسے برش یا کنگھی سے نکالے ہوئے ہوں اور اوپر چٹ لپٹی ہوئی تھی چٹ پر ''بشریٰ کے بال'' لکھا تھا۔ گھر سے جس کو رخصت کرتیں اس کی آخری استعمال شدہ چیز سنبھال رکھتیں۔ گزشتہ برس میرے پاکستان سے رخصت ہوتے وقت کی آخری تازہ ترین نشانی سنبھال رکھی تھی۔ ''میرے مولا! میری ماں کو اُسی رحمت واسعہ سے نوازیئے جس کا حوالہ آپ نے ماں کی مثال دے دے کر سمجھایا ہے ہمیں۔''

کہنے کو ان گنت واقعات ہیں۔ احساس دلانے کو بے شمار جذبے ہیں۔ مگر ایک بات سب باتوں کو جلا بخشتی ہے

.....وہ ''میری ماں'' تھی ..... راتوں کی تنہائیوں میں میرے لئے آنسو بہانے والی ۔ دن کے اُجالوں میں میرا انتظار کرنے والی۔شام کے نیم اندھیرے میں میری عافیت کی دعا کرنے والی ،اور لمبی دوپہروں میں میرے خط پڑھ کر وقتِ بتانے والی ،میری ہر بات پر توجہ دینے والی ، میرے ہر لفظ کو غور سے پڑھنے والی ..... میرے دل میں بسنے والی اور اپنے دل میں مجھے بسانے والی ..... وہ پیاری ہستی جس کے ساتھ میرا انتظار کا رشتہ ہے، وہ انتظار کا کرب جو محبت کی جوت جگائے رکھتا ہے۔

ہر گزرنے والا دن مجھے تسلی دیتا ہے کہ انتظار کی گھڑیاں کم ہوگئی ہیں ملن کا سمے قریب آتا جارہا ہے ۔ مجھے خوابوں میں کوئی دنیا سے جانے والا نظر نہیں آتا ..... بڑی منت سماجت کے بعد ایک دن میری ماں ملنے آئی ۔ خوبصورت ، جوان ،نوعمر لڑکیوں کی سرمستی اور بانکپن لئے اپنے ہاتھوں کو مہندی سے سجارہی ہیں ۔خوش اور مطمئن ۔

اپنی خوش اور مطمئن ماں کا چہرہ مجھے اندر تک سکون دیتا ہے.....اور ہر لمحہ ایسا محسوس ہوتا ہے وہ شفیق چہرہ جنت کے کسی دروازے کے پٹ سے لگا منتظر نگاہوں سے پوچھ رہا ہے۔

''بیٹی ! کب ملوگی ؟ کب آؤ گی''؟''جلدی آجانا!''

☆☆☆

شمیم فاطمہ

اِک گونہ بے خودی.....!

معلوم نہیں آپ ''بے خودی'' سے آشنا بھی ہیں یا نہیں؟ یا آشنائی کے باوجود حسبِ عادت اس تعلق کو تسلیم کرنے سے انکاری ہیں۔ (جیسے بہت سے لوگ غریب لوگوں کو اپنا رشتہ دار ماننے سے انکاری ہو جاتے ہیں، جیسے بھتہ خور، بھتہ خوری سے انکاری ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی، جیسے مجرم اپنے جرم سے انکاری ہو جاتا ہے، جیسے.....) ہم مصلحتاً اور عادتاً بہت سی باتوں کا اعتراف نہیں کرتے، تو یہ اعتراف کیسے کر سکتے ہیں کہ ''بے خودی' ہم پر بھی طاری ہوتی ہے (کیونکہ اسے ہم ''فعلِ بد'' سمجھتے ہیں اور بھلا کسی فعلِ بد کا اعتراف ہم جیسے ''نیک خو'' لوگ کیسے کر سکتے ہیں؟) بے خودی کے بارے میں یہ غلط فہمی عام ہے کہ یہ ''مے نوشی'' سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے اسکا اعتراف باعثِ رسوائی ہے، کہیں لوگ ہمیں ''بادہ نوش'' نہ سمجھ لیں۔ پھر تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے (حالانکہ ہمارا منہ کسی کو دکھانے کے لائق ہو نہ ہو ''اس کو'' دکھانے کے لائق ہرگز نہیں ہے!) مئے تلخی ایام کے آگے یہ بادہ نوشی کیا چیز ہے! جو پیتے ہیں سدا عالم بے خودی میں رہتے ہیں۔ کر کچھ رہے ہوتے ہیں، سوچ کچھ رہے ہوتے ہیں، نگاہیں کہیں ہوتی ہیں دھیان کہیں ہوتا ہے۔ بات کسی سے کرتے ہیں مخاطب کوئی اور ہوتا ہے۔ پکار کسی کو رہے ہوتے ہیں نام کسی کا لے رہے ہوتے ہیں۔ ڈھونڈتے کسی کو ہیں ساتھ کسی کے ہوتے ہیں، روکنا کسی وین کو ہوتا ہے روک کسی وین کو لیتے ہیں۔ فرج کھول کر کھڑے دماغ پر زور ڈالتے رہتے ہیں کہ آج کون سے کپڑے استری کریں! الماری کھول کر سوچتے ہیں کہ کونسی بوتل زیادہ ٹھنڈی ہے! وین پُل کے نیچے سے گزرتی ہے تو انہیں ایک دم شاک لگتا ہے کہ ہماری وین کو تو پل کے اوپر سے گزرنا تھا! (بے خودی کہیں سے کہیں لے جاتی ہے) چشمہ سر پر دھرا ہوتا ہے اور یہ اسے دراز میں، میز پر، سرہانے، کچن میں، یہاں وہاں ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں۔ لاحول پڑھتے پڑھتے جب دفعتاً ہاتھ سر پر جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ بغل میں بچہ اور شہر میں ڈھونڈورا کا کیا مطلب ہے۔ بالوں میں پن کی جگہ پین لگا لیتے ہیں، وہ تو آنکھوں والے بتاتے ہیں کہ..... (مقام درد کہاں ہے نشستِ درد کہاں.....!)

یہ ''بے خود'' لوگ دن رات اپنی واپسی کے منتظر رہتے ہیں۔ بے خودی جہاں لے جاتی ہے، چلے جاتے ہیں اور جا کر چونکتے ہیں کہ یہ کس مقام پہ لے آئی بے خودی ہم کو! مگر اچھی بات یہی ہے کہ لیجانے کا کرایہ نہیں لیتی ورنہ یہ محروم تمنا لوگ اس ''بے خودی'' کی دولت سے بھی محروم رہ جاتے۔ بے خودی کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ آپ کو کہیں نہ کہیں لے ضرور جاتی ہے۔ کسی کو بے خودی ''درِ مولا'' پہ لے جاتی ہے اور کسی کو بے خودی ''میخانے'' کے دروازے پر پہنچا دیتی

ہے۔ (کوئی حُب الٰہی میں مست ہو جاتا ہے تو کوئی حُب دنیا میں)

ہمارے وفاقی وزیر پٹرولیم (برطانوی ہائی کمیشن کی ایک پارٹی میں جو سیلاب زدگان کے لئے فنڈ جمع کرنے کی خاطر منعقد کی گئی تھی) ایسے ''بے خود'' ہوئے کہ آپے سے باہر بلکہ جامے سے باہر ہو گئے۔ (ایک تو وزارت کا نشہ! اس پر سے شراب کا نشہ! خمار تو بڑھنا ہی تھا) چنانچہ اتنا زور سے ناچے کہ.....گھنگھرو.....ٹو.....اُوٹ.....ٹ گئے! کپڑے اتار پھینکے اور نامحرم خواتین سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ (اس موقع پر بھارتی گلوکار موجود ہوتے تو ضرور یہ گانا گاتے کہ ''ناچ میری بلبل کہ پیسہ ملے گا، کہاں قدردان تجھے ایسا ملے گا'') ایسے وزیروں کو دیکھ کر بیچارے غم کے مارے عوام کا بھی جی چاہتا ہے کہ وہ بھی ایک ''گھونٹ پی لیں، اقتدار کے نشے سے تو وہ نہ لطف اندوز ہو سکتے ہیں نہ آشنا..... یہ ظلمتوں کے مارے لوگ! جو مسائل کا بارِ گراں اپنے ناتواں کاندھوں پر لادے بوجھل قدموں سے زندگی کی مسافت طے کرنے پر مجبور ہیں۔ سو طرح کے تفکرات ان کے چہروں سے زندگی کی رمق چھین چکے ہیں۔ فاقہ زدہ.....غربت زدہ..... ہیبت زدہ اور وحشت زدہ عوام! اپنا غم غلط کرنے کی خاطر..... چاہتے ہیں کہ کچھ دیر کو وہ بھی ''بے خودی'' سے لطف اندوز ہو لیں، تلخیِ ایام کو بھلا دیں، چنانچہ کچی شراب پی لیتے ہیں.....لڑکھڑاتے قدموں سے رقص شروع کر دیتے ہیں مگر اس سے پہلے کہ یہ اپنے ہوش وحواس کھوئیں اور ان کو لگے کہ سارا جہاں رقص میں ہے، دھڑام سے گر جاتے ہیں۔ کچی اور گھٹیا شراب اپنا گھٹیا پن دکھا دیتی ہے اور بیچارے بہکنے سے پہلے ہی دم توڑ جاتے ہیں (اخبار میں خبر لگ جاتی ہے کہ چیر گوٹھ۔ (محمود آباد) میں زہریلی اور کچی شراب پینے سے ۱۷ افراد مارے گئے) وائے ناکامئ شوق کہ.....! (اسی لئے تو اُمراء برانڈڈ پیتے ہیں، اور یوں بھی ان کی رگوں میں عوام کا خونِ ناحق دوڑ رہا ہوتا ہے اس لئے وہ پی کر مرتے نہیں بلکہ اور مشٹنڈے ہو جاتے ہیں)

عوام بیچارے تو روٹی، کپڑا اور مکان کے چکر میں گھن چکر بن چکے ہوتے ہیں۔ ہوش وحواس، تاب وتواں۔ سب سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ (سوان سے اگر کوئی چُوک ہو بھی جائے تو قابلِ معافی ہے اور سمجھ میں آتی ہے کہ اس بدحواسی کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔) مگر جب وزیراعظم پاکستان اپنے خطاب میں امریکی وزیر خارجہ کا نام غلط لیتے ہیں اور مشرقی پاکستان کو ایک چھوٹا صوبہ قرار دیتے ہیں تو!!.....تو کچھ لوگوں کو کریدلگ جاتی ہے کہ ''کچھ تو ہے جس کی کہ پردہ داری ہے!!'' دال میں کچھ کالا ہے.....موصوف کا حافظہ خراب ہو رہا ہے!.....اللہ جانے کس ذہنی دباؤ کا شکار ہیں۔ اللہ خیر کرے!! اب تو وہ بھی!.....لوگ تو بات کا بتنگڑ ہی بنا دیتے ہیں۔ اب ایک ایسے ملک کا وزیراعظم ہونا جو گوناگوں مسائل کا شکار ہے، کوئی آسان بات ہے! ایسے میں منہ سے الٹ پلٹ نکل جانا کونسا تعجب خیز ہے؟ پریشانی اور فکرمندی میں تو ایسا ہوتا ہی ہے کہ منہ سے کچھ کا کچھ نکل جاتا ہے۔ صدر اور

وزیر اعظم اپنے جوشِ خطابت میں کہہ گزرتے ہیں کہ ''حکومت عوام کو روٹی کپڑا اور مکان دینے میں کامیاب ہوگئی ہے۔'' (یہ اور بات کہ ان کے اس اعلان بلکہ اعلانیہ جھوٹ پر عوام ہکا بکا رہ جاتے ہیں) بے خودی میں تو ایسا ہوتا ہے۔ بقول شاعر یہ صورتِ حال ہو جاتی ہے کہ

اچھا خاصا بیٹھے بیٹھے گم ہو جاتا ہوں
اب میں اکثر میں نہیں رہتا تم ہو جاتا ہوں

اب آپ یقیناً اس ''تم'' کے بارے میں درست گمان نہیں کریں گے اور آپ کا دھیان ادھر اُدھر جائے گا۔ ہم آپ کو کیسے یقین دلائیں کہ یہاں ''تم'' سے مراد ''غریب عوام'' ہیں جن کے دکھ درد اور مسائل سے عوامی حکومت اچھی طرح آگاہ ہے اور اس میں شریک بھی۔ جبھی تو ان کی دماغی کیفیت ایسی ہوگئی ہے۔

یہ بے خودی بھی کسی نعمت سے کم نہیں، اس لئے کہ ہمیں محنت مشقت کی عادت تو ہے نہیں، بے خودی کے لئے کونسے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ جبکہ خودی کے حصول کے لئے تو محنت مشقت کرنی پڑتی ہے۔ ہر وقت ہائی الرٹ رہنا پڑتا ہے۔ ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا ہے کہ ذرا چُوکے نہیں کہ نفس نے ہمیں پھُونک دیا، اور اسے بلند کرنا اور بھی جان جوکھوں کا کام ہے۔ جبکہ ہماری سستی کاہلی، کام چوری اور آرام طلبی کا یہ عالم ہے کہ اپنی آخری آرام گاہ بھی دوسروں کے کاندھوں پر سوار ہو کر جاتے ہیں۔ مارے سستی کے ہمارا جی چاہتا ہے کہ ہم منہ بند کئے پڑے رہیں اور الفاظ اُڑ اُڑ کر خود ہی دوسروں کے کانوں تک پہنچ جائیں۔

میں کچھ نہ کہوں اور یہ چاہوں کہ مری بات
خوشبو کی طرح اُڑ کے ترے دل میں پہنچ جائے

اور تو اور مارے آرام طلبی اور سستی کے ہم سے محبت جیسا کٹھن کام بھی نہیں کیا جاتا۔

ہوگا کسی دیوار کے سائے کے تلے میرؔ
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کا

سو جتنی بے خودی میسر آسکے تھام لیجئے کہ عالمِ بے خودی میں نہ کسی کا ستم یاد رہتا ہے نہ کسی کی جفا یاد رہتی ہے۔ دوسروں کی خطائیں معاف کرنے اور دوسروں کی زیادتیاں نظر انداز کرنے کا اس سے زیادہ سنہری موقع کوئی اور نہیں ہوتا..... عالمِ بے خودی میں خودی بلند ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے!!

☆☆☆

میری لائبریری سے

کتاب: محاضرات قرآنی
مصنف: ڈاکٹر محمود احمد غازی
پبلشر: الفیصل غزنی سٹریٹ اردو بازار۔لاہور

یہ کتاب دراصل ان محاضرات (Lectures) کی کتابی شکل ہے جو محترم ڈاکٹر صاحب نے راولپنڈی اور اسلام آباد سے تشریف لانے والی خواتین مدرسات کے روح برود یئے ۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ ان لیکچرز کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی کہ خواتین مدرسات جو کہ ایک کثیر تعداد میں دروس قرآن کے ذریعے دعوت دین کو گھر گھر پھیلانے کی ذمہ داری ادا کر رہی ہیں انہیں چونکہ خالص دینی علوم یعنی علم تفسیر، علم حدیث، فقہ اور عربی زبان وکلام وغیرہ میں تخصیص حاصل نہیں ہے لہٰذا دورس کی تیاری میں بعض اوقات ایسے پہلو کمزور رہ جاتے ہیں اور ان میں بہتری کی گنجائش موجود ہوتی ہے۔ یہ لیکچرز محترم کی بہن محترمہ عذرا نسیم فاروقی صاحبہ نے منعقد کروائے اور قریباً سو مدرسات نے شرکت کی۔ بعد ازاں ''محاضرات حدیث'' ''محاضرات فقہ'' اور محاضرات سیرتِ رسول ﷺ بھی منظر عام پر آ گئیں۔ اب آتے ہیں کتاب کے مندرجات کی جانب۔

یہ کتاب مخاطبین کے ایک محدود مخصوص طبقے ہی کے لئے لکھی گئی ہے یعنی شعبہ تدریس قرآن وحدیث سے وابستہ خواتین وحضرات کے لئے۔ لہٰذا ہوسکتا ہے کہ ایک عام قاری اسے ثقیل محسوس کرے لیکن آپ یقیناً کتاب پڑھ کر محسوس کریں گے کہ مشکل موضوعات کو بھی گفتگو کے انداز میں واقعات اور امثال سے مدد لیتے ہوئے بہت آسان بنا دیا گیا ہے۔ میں خود ایک طالبہ ہونے کی حیثیت سے سمجھتی ہوں کہ ذہن میں آنے والے اور لوگوں کو پوچھے گئے کئی سوالات اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اچھی طرح سمجھ میں آ گئے اور ان کی شافی جوابات مل گئے۔ یقین کیجئے کہ ایک بار جس باب کو آپ شروع کر دیں گے اسے ختم کئے بغیر کتاب رکھ نہ پائیں گے۔

درس قرآن تیار کرنے والی تمام خواتین اور حضرات ضرور اس کتاب سے استفادہ کریں۔ یوں لگتا ہے کہ دریا کو کوزے میں بند کر کے ہمیں دے دیا گیا ہے اور مسلسل ہمیں اپنی کم علمی اور علوم دینیہ کے وسیع وعریض سمندر کی وسعت کا انداز ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان شآءاللہ یہ کتاب آپ کے شوق اور طلب میں ضرور اضافہ کرے گی۔

ابتدائی چار ابواب قرآن مجید فرقان حمید کے اعجاز، اس کے جمع وتدوین کے سلسلے میں کی گئی کاوشوں، وحی کی نوعیت اور اقسام اور مکی و مدنی سورتوں کے مضامین اور بنیادی خوائص پر مشتمل ہیں۔ اتنی پھیلی ہوئی معلومات کو

نجانے کس طرح چار ابواب میں سمیٹ دیا گیا ہے۔ کتنی ہی تاریخی حقیقتیں ایسی ہیں جن کا علم پہلی بار قاری کو اس کتاب کے مطالعے سے حاصل ہوگا۔

پھر پانچویں باب سے ساتویں باب تک علم تفسیر کا تعارف، بڑے بڑے بلند پایہ مفسرین قرآن کے تذکرے اور عہد نبویؐ سے لے کر اب تک لکھی گئی تفاسیر پر کلام کیا گیا ہے۔ تفاسیر کے بحر زخار میں سے منتخب تفاسیر کو لے کر ان کی خصوصیات بتائی گئی ہیں۔

محترم ڈاکٹر صاحب جب مفسرین قرآن کریم کا تذکرہ کرتے ہیں تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے لے کر مجاہدین، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبل، امام طبری، علامہ محمود بن عمر زمخشری، امام رازی پھر علامہ ابن کثیر سب کے مختصر مختصر حالات اور ان کی تفاسیر کی نوعیت وخصوصیات کو اس اسلوب سے بیان کرتے ہیں کہ معلومات میں بے پناہ اضافے کے ساتھ ساتھ دلچسپی کا عنصر بھی شروع سے آخر تک قائم رہتا ہے۔

ساتواں باب بڑا دلچسپ ہے اس کا نام ہے ''تفسیری مناہج'' جس کا مطلب ہے کہ تفسیر میں شروع سے اب تک کون کون سے رجحانات پیدا ہوئے۔ یہاں بتایا گیا ہے کہ تفسیر بالماثور کیا ہے تفسیر باللغۃ اور تفسیر بالرائے سے کیا مراد ہے۔ کس زمان میں کس قسم کی تفسیری کاوشیں ہوتی رہی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی افادیت، اہمیت اور تفسیر کے علمی کام پر اس مخصوص رجحان کا کیا اثر پڑا۔ یہ سب کچھ بہترین طریقے سے سمجھایا گیا ہے۔ آٹھواں باب ''اعجاز القرآن'' ہے جس میں قرآن پاک کے وہ معجزات جو نزول قرآن کے صدیوں بعد وقوع پذیر ہوئے یا انسانی علم میں آئے انہیں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور دل قرآن پاک کی عظمت ورفعت کا مزید قائل ہوتا چلا جاتا ہے۔

نواں باب ''علوم القرآن'' پر مشتمل ہے۔ اس میں ان علوم کا انتہائی جامع اور مختصر تعارف دیا گیا ہے جو قرآن سے متعلق ہیں جیسے

فضائل القرآن، خواص القرآن، امثال القرآن، قصص القرآن وغیرہ۔

گیارہواں اور بارھواں باب ہم جیسے کم علم مگر طالبان علم کے لئے حد درجہ فائدہ مند ہے یعنی ''قرآن کا موضوع اور اس کے اہم مضامین'' اور ''تدریس قرآن دور جدید کی ضروریات اور تقاضے''

ان مضامین میں دین، شریعت، فقہ اور ذوق ان چار اصطلاحات پر کھل کر کلام کیا گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ غیر مسلم کو ''دین'' کی دعوت دی جاتی ہے جو کہ پہلا مرحلہ ہے اور اس میں تمام اساسیات یعنی ایمان، عقیدہ، مکارم اخلاق آجاتے ہیں۔ یہ دین تمام مسلمانوں کا ایک ہی ہے اور اسی کی طرف غیر مسلم کو بلانا ہے۔ پھر دین میں جو داخل ہو گئے اب ان کو شریعت کی تعلیم دی جائے گی جس میں احکامات کی تفصیلات آئیں گی۔ اس میں ایک سے زائد آراء ہوسکتی ہیں۔ یہاں تک کہ دور نبویؐ میں بھی اختلاف رائے ہوا۔ اس میں کوئی برائی نہیں۔ پھر اس سے آگے تخصیصی علم ہے فقہ کا یہ علم ہر کوئی حاصل نہیں کرتا بلکہ دوسرے علوم کی طرح

ماہرین تیار کئے جائینگے اور عام آدمی بوقت ضرورت ان سے استفادہ کرے گا۔آخری چیز ذوق یہ ہے کہ کسی استاد کا اپنا نقطہ نظر یا پسند نا پسند ہے اسے دوسرے لوگوں پر نہیں ٹھونسا جاسکتا۔ ہر شخص مختلف ذوق رکھتا ہے یہاں تک کہ صحابہ کرام میں بھی ایسی مثالیں ہیں۔کسی میں شغفِ عبادت زیادہ تو کسی میں سادگی وترکِ لذات۔

آخری باب میں بڑے اہم سوال کا جواب دیتے ہیں ۔تفاسیر کے ذخیرے میں سے ہم کن تفاسیر کا انتخاب کریں دورس قرآن کی تیاری کے لئے ؟ یہاں مصنف نے موجودہ دور کی اردو تفاسیر پر سیر حاصل گفتگو کی ہے ۔سب کو باری باری ڈسکس کیا ہے۔

ایک اہم نکتہ یہ اٹھاتے ہیں کہ ترجمہ وتفسیر پر کام کرنے والے بزرگان دین بلا شبہ بڑے پائے کے لوگ تھے انہوں نے نصف صدی خود مطالعہ میں گزار دی تب کہیں جا کر قلم اٹھانے کی جرأت کی مگر بحر حال تھے یہ سب انسان ہی ۔ ہر ایک تفسیری کاوش لکھنے والے کی اپنی فہم وبصیرت پر مبنی ہے اس لئے کسی تفسیر کو خود قرآن کا قائم مقام سمجھ لینا درست نہیں اور ہر مفسر سے غلطی ہوجانے کا امکان موجود ہے۔

معلومات کا یہ خزانہ یعنی یہ کتاب میرے محترم ماموں جان ''ڈاکٹر ظفر اسحٰق انصاری'' نے مجھے تحفتاً دی تھی ۔الحمد للہ خود بھی استفادہ کیا اور مزید جلدیں منگوا کر دوسروں کو بھی دی ۔ اللہ تعالیٰ میرے ماموں جان کو اور ڈاکٹر غازی صاحب کو ڈھیروں جزائے خیر دے۔ جنہوں نے اپنے گہرے علمی ذخیرے کو ہمارے لئے عام فہم زبان میں صفحہ قرطاس پر بکھیرا اور ہم سب کو عمل کرنے والا مدرس قرآن بنائے آمین۔ اس کتاب کو ضرور خرید یئے اور ضرور پڑھیئے ۔درس تیار کرنے والی دوسری خواتین تک پہنچایئے۔

☆☆☆

داستانِ عطا و بخشش

ساتھیوں کیلئے دعا

ڈاکٹر سعیدہ عظمت 1995/96ء سے ریفرل سنٹر میں ہفتہ میں ایک دن مریض دیکھا کرتی تھیں۔ جب بیٹیوں کی شادیاں ہوگئیں تو شاہدرہ بھی ہفتہ کے روز جانا شروع کیا۔ انہیں وہاں جا کر کام کرنا بہت پسند آیا۔ سچی بات ہے جو لوگ صرف اللہ کی رضا و خوشنودی کیلئے اس کے بندوں کی خدمت کرتے ہیں انہیں وہ ضرور سکونِ قلب عطا کرتا ہے۔

مئی 2004ء میں ہماری نہایت اہم اور مخلص ساتھی ڈاکٹر خورشید ملک فوت ہوگئیں۔ اس وقت ان کی عمر اسی (80) برس تھی۔ اپنی تکالیف کے باوجود چھٹی نہ کرتی تھیں بلکہ شاہدرہ جا کر مریض دیکھنے کو اپنے لیے ''تھیراپی'' سمجھتی تھیں۔

ان کے اس جہاں سے رخصت ہونے کے بعد یکدم کمی ہوگئی۔ مددگار بھی کچھ کم ہونے لگے تھے۔ بہن گُل رعنا شہر کے دوسرے کونے میں آباد ہوگئیں۔ آپا ساجدہ اور بیگم عامر مستقل بیمار رہتیں تھیں۔ البتہ مسز ریحانہ رفیق زیادہ ہی کام سنبھالنے لگی تھیں۔ مخلص ساتھیوں کی دعا قبول ہوئی۔ سلمٰی انور کراچی سے لاہور منتقل ہوئی تھیں۔ بہت اچھی مددگار ثابت ہوئیں۔ نائلہ یوسف بھی شوق سے کام سیکھنے لگیں۔ گُل رعنا بھی دوری کے باوجود کبھی کبھی کافی تگ و دو کے بعد ہمارا ساتھ دیتی ہیں۔ اسی طرح فوزیہ احمد گھریلو مشکلات کے باوجود ایک ہفتہ چھوڑ کر آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر نگہت زمان (ہومیو) کو ٹرسٹ میں عطا کیا اور کمی پوری کر دی۔ 2005ء کا موسم خزاں تھا۔ نگہت کی امی جان بیگم صفیہ ہارون اور بڑی بہن مسز انجم ہارون سے ملاقات کیلئے جانا ہوا۔ ان سے بھی ملاقات ہوئی بلکہ ایک مریض دیکھ کر آئی تھیں۔ میں نے ڈاکٹر کی کمی کا ذکر کیا تو جیسے یکدم اللہ نے ان کے دل میں ڈالا کہنے لگیں ''میں وقت نکال سکتی ہوں۔'' یہ سن کر بے حد خوشی ہوئی اور اس دن سے وہ ہمارے ساتھ اس طرح بے تکلف ہو چکی ہیں جیسے ہمیشہ سے جانتی ہوں۔ یہ سب ہمارے ربِ رحیم ہی کی مہربانیاں ہیں۔ ساتھیوں کا ہم خیال ہونا بے حد ضروری ہے چونکہ ڈیڑھ گھنٹہ کا تو سفر ہے وین میں سب اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں جو کہ سب کی دلچسپی کا باعث ہوتی ہیں۔

ہمارے میڈیکل سنٹر گارڈن ٹاؤن میں ہر شعبہ کی لیڈی ڈاکٹر اور ڈاکٹر حضرات آتے ہیں مگر ڈاکٹر نبیہہ حسن جیسا فزیشن نہیں مل رہا تھا۔ اللہ کے فضل و کرم سے چند سال پیشتر ہمیں تین عدد فزیشن یکے بعد دیگرے عطا ہوئے جو کہ پاکستان کے باہر سے ریٹائر ہو کر آئے ہیں۔

ڈاکٹر اخلاق صاحب اور ڈاکٹر چشتی بروز بدھ اختر مبارک سینٹر میں وقت دیتے ہیں اور ڈاکٹر یعقوب جمعرات کے روز فاطمہ طفیل سنٹر (64-P) ماڈل ٹاؤن میں وقت دیتے ہیں اسی جگہ ڈاکٹر راشدہ حمید ڈاکٹر زاہدہ افتخار اور ڈاکٹر ذکیہ طلعت بھی مریضوں کو دیکھتی ہیں۔

نابینا رخسانہ کی کہانی

1995ء کی بات ہے ایک عورت بچوں کی دوائی لینے آئی جس کی بینائی کافی کمزور تھی۔ سات سالہ بیٹے نے ماں کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ ڈیڑھ سال کا بیٹا گود میں اور چار سالہ بچہ پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

اس نے اپنا نام رخسانہ بتایا۔ ''شوہر کیا کام کرتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہم تو فقیر ہیں، جو صدقہ، خیرات مل جاتا ہے اس پر ہماری دال روٹی چل رہی ہے۔''

''مگر یہ تو کوئی پیشہ نہ ہوا۔ اخراجات کیلئے محنت مشقت کرنی چاہیے۔''

وہ تو جیسے یکدم پھٹ پڑی۔ ''جی میرا بندہ ترکھان ہے۔ عزت کی روٹی کھاتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے کسی کا سامان خراب ہو گیا۔ انہوں نے اُجرت تو کیا دینی تھی دھکے دے کر نکال دیا۔ اب اس کا دل اتنا ٹوٹ گیا ہے کہ کوئی کام نہیں پکڑتا۔''

میں نے فوراً بات بدلی ''کتنے بچے ہیں؟''

''جی یہ تین بیٹے ہیں اور ان سے بڑی دو بیٹیاں ہیں وہ گھر میں ہیں۔''

''بچے پڑھتے نہیں ہیں؟''

''جب حالات اچھے تھے تو بڑی دوسری میں پڑھتی تھی چھوٹی پہلی میں..... ابھی بیٹے کو داخل کرنا تھا کہ کاروبار ختم ہو گیا۔ وہ بھی گھر بیٹھی ہے۔''

''انہیں پڑھنے کا شوق ہے؟''

''جی بڑی ارم کو تو بہت شوق ہے چھوٹی اب کسی کے گھر میں کام کرتی ہے اور اس کو زیادہ شوق بھی نہیں۔''

''اچھا رُخسانہ ابھی تو تم دوائیاں لو اور گھر جاؤ۔ اگلے ہفتے ارم کو لے کر آنا۔ سوچتے ہیں کیا بندوبست کر سکتے ہیں۔''

وہ وعدے کی پکی نکلی، اگلے ہفتہ بیٹی ارم اور چھوٹے بیٹے کے ساتھ موجود تھی۔ میں نے سب سے پہلے اسی کی طرف توجہ کی۔ دوسری ڈاکٹر مریضوں کو دیکھنے لگی تھیں۔ میں نے رخسانہ اور بچوں کو ساتھ لیا اور سٹاف روم میں آ کر ایک ٹیچر کو بلوایا۔

''مس عطیہ آپ اس بچی ارم کا دوسری کلاس کا اردو کا ٹیسٹ لیں۔ میں ادھر ہی بیٹھی ہوں ابھی مجھے رپورٹ دیں۔''

''جی اچھا'' یہ کہہ کر وہ کلاس روم میں بچی کے ساتھ چلی گئی۔

اللہ کے فضل سے اس جگہ ہمارا ماحول بہت اچھا بن چکا ہے۔ سکول کے بہت اچھے کمرے بنے ہوئے ہیں۔ کے جی، نرسری اور پھر پانچویں تک کلاسیں ہیں، تقریباً سات اساتذہ پڑھاتی ہیں۔ بروز ہفتہ بچوں کو دس بجے چھٹی دے دی جاتی ہے۔ جبکہ اساتذہ جن کو ہم نے دوائیاں دینے کی تربیت دی

ہوئی ہے، ان میں سے چند ایک پرچیاں بناتی ہیں، باقی ڈسپنسری میں نسخے تیار کرتی ہیں۔ کھڑکی کے پاس اکثر مسز ریحانہ رفیق بیٹھتی ہیں جو دوائی دیتی بھی ہیں اور سمجھاتی بھی ہیں۔ نیز پرچی کے لیے مقرر کی ہوئی معمولی سی رقم بھی وصول کر لیتی ہیں۔ دو عدد آیا بھی مریضوں کو کنٹرول کرنے اور شفاخانے کی صفائی ستھرائی کیلئے موجود ہوتی ہیں۔ ایک تو مستقل سکول کی ڈیوٹی والی ہے۔ دوسری خاص شفاخانہ کیلئے رکھی گئی کہ ادھر صفائی کی بھی بہت ضرورت رہتی ہے۔

اس روز میں رخسانہ اور اس کے سب سے چھوٹے بچے کے ساتھ سٹاف روم میں بیٹھی تھی۔ وہ اپنے گھریلو حالات بتا رہی تھی۔ میں نے کہا ''اپنے شوہر سے کہو اس بارے میں سوچے کہ اگر ہمارا ٹرسٹ اس کو کچھ مالی امداد دے تو وہ تھوڑا سامان خرید کر لکڑی کی کچھ آسان چیزیں بنا کر خود ہی بیچے۔ شاید اس کا کام کچھ چل جائے۔ یوں فارغ بیٹھنے سے تو بہتر ہے۔''

وہ بولی ''اچھا جی میں ضرور پوچھ کر آپ کو بتاؤں گی۔''

''تقریباً بیس پچیس منٹ میں مس عطیہ، ارم کے ساتھ سٹاف روم میں آئیں اور بتایا کہ یہ لڑکی دوسری کلاس کی پڑھائی لکھائی میں بہت اچھی ہے بلکہ گورنمنٹ کے سکول میں اس نے دوسری کلاس میں سیکنڈ پوزیشن حاصل کی تھی۔ حساب بھی صحیح آتا ہے!''

''بس آپ اس کو تیسری کلاس میں داخل کر لیں۔ اگرچہ یہ داخلوں کا مہینہ نہیں ہے مگر خاص طالب علموں کیلئے ہمیں قوانین میں نرمی کرنی پڑتی ہے۔'' میں نے ارم کی والدہ سے کہا ''اس کی تعلیم کے تمام اخراجات ٹرسٹ برداشت کرے گا۔ یونیفارم سے لے کر کتابوں تک.....اور پانچ سو روپے ماہوار وظیفہ بھی دیں گے۔ خوراک وغیرہ کیلئے۔''

اگلے ہی روز سے ارم نے تیسری جماعت کی تعلیم شروع کر دی۔ میں اس بچی کے بارے میں وقتاً فوقتاً کلاس ٹیچر سے پوچھتی رہتی۔ وہ بہت شوق سے پڑھتی اور نہایت تابع فرمان شاگرد تھی۔ تیسری سے لے کر پانچویں جماعت تک وہ تیسری پوزیشن حاصل کرتی رہی۔

سالانہ امتحانات کے بعد ہر سال سکول کا سالانہ جلسہ منعقد ہوتا ہے جس میں انعامات دیئے جاتے ہیں، بچیاں اچھے اچھے پروگرام بھی پیش کرتی ہیں.....

1998ء کا سالانہ جلسہ تھا اس میں پانچویں کلاس کے انعامات تقسیم ہو رہے تھے۔ ارم کو تیسری پوزیشن کا انعام ملا..... مجھے بیحد خوشی ہوئی۔

جلسے کے بعد تمام بچوں میں کھانے کے پیکٹ تقسیم ہوتے ہیں اور ان کے عزیزوں کیلئے بھی کھانے کا بندوبست ہوتا ہے۔ مجھے ارم کی والدہ رخسانہ نظر آئی، وہ کسی کے انتظار میں برآمدے میں کھڑی تھی..... اس کا چھوٹا بیٹا جو کہ اب نرسری میں تھا میرے پاس آیا۔ ''اماں آپ کو بلاتی ہیں۔''

میں رخسانہ کے پاس گئی، اس کو ارم کی مبارکباد دی، وہ نہایت خوش تھی۔ اس نے مجھے ایک تحفہ پیش کیا.....لکڑی کی مصالحے ڈالنے والی صندوقچی بہت صفائی سے بنی ہوئی، میری طرف بڑھائی اور کہنے لگی یہ آپ کے لیے ہے۔ میں نے اُسے ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھا۔ بہت خوشی ہوئی کہ

بچوں کا باپ پھر سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا تھا۔

پھر میں نے شکریہ کے ساتھ یہ کہتے ہوئے واپس کر دی کہ ہمیں تحفے یہاں سے لینے کی اجازت نہیں ہے، تم اپنے گھر میں اس کو استعمال کرو۔

پھر کچھ سال تک مجھے ان لوگوں کی کوئی خبر نہ ملی۔ پچھلے سال (2009) ستمبر میں رخسانہ اپنے بڑے بیٹے کی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر آئی۔

''ڈاکٹر صاحب ارم کی شادی طے ہو گئی ہے!'' وہ بہت خوشی سے بولی۔

''کہاں بیاہ کر جا رہی ہے؟''

''جی پھوپھی کے ہاں ساہیوال''

''اچھا تو ہم کس طرح مدد کر سکتے ہیں؟''

''جی اس کو سلائی سکھائی ہوئی ہے، مشین کرایہ پر لے کر کپڑے سیتی ہے۔ آپ شادی میں مشین دے دیں اور کچھ نقد..... جو بیاہنے آئیں گے ان کو کھانا کھلا دیں گے۔''

''ٹھیک ہے دو ہفتے بعد آنا کیونکہ مشین ہمیں آرڈر کرنی ہوتی ہے اس میں کچھ وقت لگتا ہے۔''

''جی اچھا'' وہ بے حد مطمئن نظر آئی۔

''یہ بتاؤ تمہیں موٹر سائیکل پر کون لے کر آیا ہے''؟

''یہ جی میرا بیٹا ہے اس کو پانچ پاس کرنے کے بعد بجلی کا کام سکھایا تھا تو اب اچھی روزی کما لیتا ہے، ارم کے برتن کپڑے اسی کی کمائی سے بن رہے ہیں!''

مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میرے آنسو نکل آئے (شاید میں زیادہ ہی جذباتی واقع ہوئی ہوں) میں نے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم شامل حال رہے تو سب وعدے اور پروگرام پورے ہو جاتے ہیں۔

وہ دو ہفتے بعد آئی۔ ساتھ میں بڑا بیٹا تھا، اس نے سلائی کی مشین اٹھا لی، رخسانہ نے رقم پکڑی اور بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے روانہ ہو گئی۔ (جاری ہے)

☆☆☆

کاش وقت لوٹ آئے!

لفظ ٹوٹ گئے ہیں اور ان آنسوؤں کے ساتھ زمین پر جا گرے ہیں جو مسلسل آنکھوں سے بہہ رہے۔ ہیں دل جانے رہا یا نہیں رہا لیکن سینے میں اک عجب سا درد باقی رہ گیا ہے۔ میں، میں نہیں رہی بس اک سایہ باقی رہ گیا ہے جو خود اپنے ہی پیروں پر ڈھیر ہو جانا چاہتا ہے۔ میری ماں کی خالی خالی نگاہیں مجھ سے برداشت نہیں ہوتیں، وہ جو بار بار کہتی ہیں ہائے میں تو مٹی کا ڈھیر ہوگئی تو دل ریت بن کر بند مٹھیوں سے پھسلنے لگتا ہے۔ بڑی امی کو کیا کہوں، جو بے بسی ان کی گود میں آ کر بیٹھ گئی ہے اس نے بڑی دلیری سے میری پیشانی پر یتیم لکھ دیا ہے۔ آسمان کا سینہ پھٹ کیوں نہیں جاتا اور ہوکوں کی طرح خالی خالی سی یہ ہوا یکدم رک کیوں نہیں جاتی۔ وقت کی آنکھیں پتھرا کیوں نہیں جاتیں کہ میرے پاپا کی تصویر یہیں جم جائے۔ میرے پاپا کی آواز بس گونجتی ہی رہے۔ مجھ سے بات کرتے ہی رہیں۔ میں جب چاہوں ہمک کر ان کے سینے سے لگ سکوں۔ میری ماں کی مسکراہٹ لوٹ آئے اس کی آواز کی کھنک لوٹ آئے۔ اس کے لئے زندگی کے رنگ لوٹ آئیں۔ کیسے بھولوں وہ لمحہ، وہ بے بسی جب میری خالی ہاتھ ماں نے عجب بے بسی سے مجھے کہا۔ مریم تمہارے پاپا چلے گئے چلے گئے اور میرے آنسوؤں نے میرے لئے رستہ ہی دھندلا دیا۔ سامنے اس پردے سے پرے میرے پاپا موجود تھے لیکن وہ بانہیں آج مجھے سینے کے ساتھ لگا لینے کو نہ اٹھیں۔ ان لبوں پر کوئی مسکراہٹ نہ ابھری، وہ آنکھیں مجھے دیکھ کر چمک نہ اٹھیں، کسی نے نہ کہا 'او میرا بچہ آ گیا' اب کون کہے گا؟ کون کہے گا؟ اس کمرے میں موجود وہ اجنبی جو میرے پاپا کے اردگرد کھڑے تھے مجھے بار بار کہتے آپ باہر جائیں، میں نے کہا یہ میرے پاپا ہیں، میرے پاس اب بہت تھوڑا وقت ہے۔ میں کچھ نہ کہوں گی، مجھے یہیں رہنے دیں اور وہ خاموش ہو گئے۔ میں اپنے پاپا کو مسرت سے دیکھتی رہی۔ میرا دل بس اک ٹیس بن گیا لیکن پاپا نے تڑپ کر مجھے اپنے سینے سے نہ لگایا۔ آنسو بے معنی ہو گئے۔ فریادیں بے معنی ہوگئیں۔ خاموشیاں میرے اردگرد پھیل گئیں اور میں انہی کا حصہ بن گئی ہوں۔ صرف میں ہی کیا ہمیشہ ہنسنے والی عائشہ کیسے بلک بلک کر روتی ہے۔ میں نے اسے دیکھا تھا تو میرا حوصلہ ٹوٹ گیا تھا۔ امی کو سینے سے لگائے میں بار بار کہتی رہی صبر ماں صبر لیکن میری ماں کو صبر کیسے آتا۔ ہمیشہ انہیں بلانے والے پاس بٹھانے والے پاپا جو خاموشی سے بے نیازی سے پلنگ پر لیٹے تھے اور کسی کی آواز سے نہ اٹھتے تھے۔ عائشہ کے گلے لگ کر میں کتنا روئی،

---

[1] بنتِ سید فاروق گیلانی، صاحبزادے سید اسعد گیلانی مرحوم

عائشہ ! ہم تو کہتے تھے کہ پاپا کو کبھی کوئی تکلیف ہوئی تو ہمارے دل بند ہو جائیں گے لیکن ہمارے دل نہ بند ہوئے عائشہ ہم یتیم بھی ہو گئے اور ہمیں کچھ نہ ہوا اور پاپا بھی کیسے سنگدل ہو گئے ۔ خاموشی سے سب کچھ سنتے رہے لیکن آنکھیں نہ کھولیں ۔ میں خاموشی سے ان کے پلنگ کی پائنتی کے پاس جا بیٹھی ان کے بازو پر سر ٹکا لیا اور ان کے ہاتھ پر ہاتھ پھیرتی رہی ۔ میرے پاپا کا ہاتھ تھا ۔ میرے پاپا کا بازو تھا اور وقت کتنا کم تھا ۔ ایک بار لوگ انہیں لے جاتے تو میں نہ مل سکتی ۔ میں اس احساس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے ہاتھ پر ثبت کر لینا چاہتی تھی ۔ پھر امی کی آواز آئی تو میرا دل پھٹنے لگتا ۔ اُف میری ماں ، میں وقت کیسے واپس لے جاؤں ، کیسے خوشیوں کے قدموں میں گر کر آپ کی خوشیاں واپس لے آؤں ، کیسے پاپا کو بلا لاؤں ، کیسے ؟ کیسے ؟ میرے لفظ نوحے بن گئے ہیں ۔ میں خالی صفحہ سامنے رکھوں تو یہ بین کرنے لگتے ہیں ، آنسو بہنے لگتے ہیں ۔ میں لکھ نہیں سکتی ۔ میرے جملے بے ربط ہو گئے اور میرا دل پتھر کا ہو گیا ۔ یا اللہ تو جو ستر ماؤں سے زیادہ اپنے بندوں سے پیار کرتا ہے ۔ میرے مالک ، میری بوڑھی دادی جسے خوش قسمت سے بد قسمت ہونے میں چند ثانئے لگے ۔ جو یوں بے طرح روتی ہے کہ ہمیں اپنا دکھ بھولنے لگتا ہے اس کی بھلا کیا عمر تھی کہ وہ اپنے بیٹے کی قبر پر جاتی ۔ وہ جو ٹھیک سے سیدھی زمین پر چل نہیں سکتی وہ ٹیڑھے میڑھے راستوں پر چل کر اس قبر تک پہنچتی ہے جس پر چند دن میں سنگ مرمر کی ایک سل پر لکھا میرے پاپا کا نام بھی لگ جائے گا ۔ لیکن وہ تو بس مٹی کا ڈھیر ہے بس مٹی کا ڈھیر مسکراتا ، باتیں کرتا ان کا بیٹا نہیں اور ان کا بیٹا ان کو یہاں چھوڑ کر اپنے ابا جی کے پاس جا چکا ۔ وہ کہتی ہیں بچپن سے میرا خیال کرنے والا میرا بیٹا اتنا سنگدل کیسے ہو گیا کیا کہوں ، میں تو اب سوچ بھی نہیں سکتی ۔ صبح اٹھنے کے بعد پاپا سے بات کئے بغیر میرا دن نہ شروع ہوتا تھا ۔ اب کوئی دن کبھی میرے لئے طلوع نہ ہو گا ۔ میں انتظار میں رہوں گی اور میرے گھر کے گیٹ پر کبھی پاپا کی گاڑی نہ آ کر رکے گی ۔ پاپا کبھی چائے پینے نہ آئیں گے وہ کبھی مجھے یہ نہ کہیں گے چلو بیٹے کلب چلیں لیکن ساڑھے پانچ سے دیر نہ ہو اور میں اس انتظار میں ہی رہوں گی کہ اب پاپا مجھے آواز دیں گے لیکن اب یہ آواز تبھی آئے گی جب میں تیار ہوں گی اور پاپا مجھے لینے آئیں گے ۔ تب وہ مجھے آواز دیں گے ۔ آؤ بیٹے چلو اور میں دوڑ کر ان کے سینے سے جا لگوں گی ۔ چلیں پاپا ، میں نے بہت انتظار کیا ہے ۔ میں ان کا ہاتھ پکڑ لوں گی ۔ چلیں پاپا چلیں بہت دیر ہو رہی ہے ۔ چلیں میں بہت روئی ہوں ، میں تو ہوک ہی بن گئی تھی ۔ بے وجہ ہی ادھر اُدھر آپ کو ڈھونڈا کرتی تھی ۔ لیکن آپ نہ ملتے تھے پاپا ، میں نے بہت صبر کیا ، بڑی امی کے لئے ، امی کے لئے ، سارے چھوٹوں کے لئے مجھے لگتا تھا میں پتھر کی ہو گئی ہوں لیکن آج پھل مل گیا ہے پاپا شکر ہے آپ آ گئے ہیں اور انہیں زور سے بھینچ کر گلے ملوں گی ۔ بڑی دیر ہو گئی تھی پاپا ۔ میں پھر ہنس سکوں گی ، میرا دل پھر معمول سے دھڑکے گا ۔ میں پھر وہی مریم بن جاؤں گی ۔ اپنے پاپا کی بیٹی !

یہ لفظ اب میرے لئے گونگے ہو گئے کیونکہ میری ان

سے دوستی تو پاپا نے کروائی تھی اور اب میرے پاپا ہی نہیں رہے۔ اور آج جب میرے سینے میں میرے پاپا کے نام کی ہوک بس گئی ہے تو میں ان لفظوں سے ہی نا آشنا ہوگئی ہوں ۔میرے کان میں بار بار پاپا کہتے ہیں لکھو مجھے تمہارے کالم کا انتظار ہے لیکن میں بے بس ہوں ۔مٹی کا وہ ڈھیر جو ایچ الیون کے قبرستان میں میرے پاپا کے نام سے منسوب ہوگیا ہے وہ میرے سینے پر آ بیٹھتا ہے ۔لیکن کیسی عجیب بات ہے کہ اس کے وزن سے بھی میری پسلیاں نہیں ٹوٹتیں اس شخص کو میں نے روکا تھا۔مت ہاتھ لگاؤ یہ میرے پاپا ہیں اور سفید چادروں میں میں اپنے پاپا کو لپیٹتی رہی وہ مجھے گلابی کمبل میں لپیٹ کر زندگی کی جانب لائے تھے ۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی میں نے کیسا فرض نبھایا۔سفید چادروں میں لپیٹ کر انہیں خدا کے حوالے کر دیا۔ میں روتی رہی بلکتی رہی'' میرے بچے'' کی صدا نہ آئی ۔جس سینے سے سر لگا کر میں اطمینان سے سارا دن گزار لیا کرتی تھی اس سینے کے اوپر میں نے ٹھنڈی سفید چادر خود ہی ڈالی ۔ بڑا حوصلہ کیا۔ ننھی مریم کے سر کے بال لمحوں میں سفید ہو گئے ۔زندگی کتنی مشکل ہوتی ہے اس کا بوجھ چند لمحوں میں ہی کاندھوں پر آ گرا۔ میں کبھی پریشان ہوتی تو ہر مشکل کا حل میرے جادوگر باپ کے پاس تھا اور وہ جادوئی جملہ'' فکر نہ کر بچے تمہارا باپ ابھی زندہ ہے ۔'' تو اب میرا دل پھٹ کیوں نہیں جاتا۔اب میرا باپ زندہ نہیں ہے ۔اپنے بچوں کی ذرا سی آواز پر تڑپ اٹھنے والے پاپا آج آواز کیوں نہیں دیتے ۔اللہ کی مرضی .....لیکن اللہ کی رضا ، اللہ کی آزمائش کو نبھانا کتنا مشکل ہے یہ میں آج سمجھی ہوں ۔ میں نے اپنی زندگی کی ہر صبح کا آغاز انہی کی آواز سے کیا ہے ۔ ہر صبح میں انہی سے بات کرتی اور صبح اب بھی ہوتی ہے لیکن جانے کیوں اس میں روشنی نہیں ہوتی ۔ ہر صبح مٹھی بھر مٹی میرے دل پر ڈالی جاتی ہے ۔ مجھے کچھ اور یاد نہیں آتا ۔ کچھ اور سمجھ نہیں آتا ۔کچھ اور محسوس نہیں ہوتا ۔اب تو لگتا ہے کہ کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا ، امیرا ماتھا چوم کر اب کوئی مجھے میرے بچے نہیں کہے گا۔

میں صبح ہوتے ہی کوشش کرتی کہ ساڑھے سات تک فارغ ہو جاؤں ۔ پاپا کے ساتھ ناشتہ کرنے کے لئے پہنچ جاؤں میں جس دن چلی جاتی پاپا کہتے بچے میرا دل خوش کر دیا ہے ۔اب کوئی راستہ میرے پاپا تک نہیں جاتا ۔اب میں کبھی ان کے سینے سے لگ کر ان کی خوشبو کو محسوس نہیں کر سکتی ۔اب مجھے ان کی آواز سنائی نہیں دے گی ۔ میرا کوئی آنسو اب انہیں اتنا بے چین نہیں کرے گا کہ وہ تڑپ کر مجھے گلے لگا لیں ۔ وہ چلے گئے میں ان سے اکثر کہتی ، پاپا میں بہت خوش ہوں وہ کہتے میں بھی بہت خوش ہوں ، پھر ہم گھنٹوں باتیں کرتے ۔موضوعات ختم ہی نہ ہوتے ۔ باتیں بھی کبھی ختم نہ ہوتیں ۔ اب میں سب سے ان کی باتیں کرتی ہوں ۔ باتیں ختم ہی نہیں ہوتی لیکن میں ختم ہوگئی ہوں ۔ایسا لگتا ہے کہ زندگی سے تعلق ہی ختم ہوگیا ہے ۔ جملے ختم ہو گئے ہیں ،لفظ میرے آنسوؤں نے دھو دیئے ہیں اب میں کبھی نہ لکھوں گی کیونکہ اب کسی نے مجھے فون کر کے یہ نہیں پوچھنا کہ بیٹے کالم لکھا ؟ کیا لکھا ؟ بس یادیں دھوئیں کے بگولوں کی مانند باقی رہ گئی ہیں ۔حقیقت کے صرصر اور صموم نے مجھے جلا کر خاک کر

دیا ہے۔ میرے دل کی جگہ اب ایک خالی پن ہے۔ صحراؤں میں جیسے ہوا بین کرتی ، بال کھولے گھومتی ہے ۔ وہ وحشت میرے سارے وجود میں ہے اور میرے پاس اس کا کوئی اُپائے نہیں کوئی حل نہیں کیونکہ سارے حل تو میرے پاپا کے پاس تھے۔

میرے بس میں ہوتا تو میں ان کے جسم سے یوں لپٹ جاتی کہ میری زندگی ان کے جسم میں داخل ہو جاتی۔ میں ان کو کھو نہیں سکتی تھی لیکن میں کیسی بے بس ہوں۔ کھو بھی دیا اور اس احساس کے ساتھ میں اب زندہ بھی ہوں اور جانے کب تک رہوں گی ۔ میں کتنی بے بس ہو گئی ۔ میرے پاپا کے سارے دوست مجھے ملتے رہے اور یہ بتاتے رہے کہ میں ان کی کتنی لاڈلی تھی ۔ اپنا غم میرے ساتھ بانٹتے رہے اور میں کچھ نہ کہہ سکی۔ اتنا بھی نہیں کہ اب بس کریں، میرا دل پھٹتا ہے۔ میری زندگی کا تو کوئی مشورہ ان کے علاوہ کسی سے نہ تھا ۔ میرا تو کوئی اور دوست بھی نہیں تھا۔ مجھے تو کبھی اپنے بچوں کا بھی خیال نہ آیا تھا۔ بس پاپا تھے اور میں تھی اور اب میں ہوں بس میں ، اکیلی تنہا ، وقت کا بھنور ، بے بسی اور یہ درد جو میرے دل میں بس گیا ہے۔

میں ایک ہوک بن گئی ہوں، میرے پاپا مجھے نہیں ملتے ، میں دوڑ دوڑ کر قبرستان جاتی ہوں، وہاں نہیں ملتے ۔ میں گھبرا کر واپس لوٹ آتی ہوں۔ اپنی کرسی پر وہ دکھائی نہیں دیتے ۔ میں اندر کمرے میں چلی جاتی ہو۔ اپنے بیڈ پر بھی نہیں ہیں ۔ شاید باتھ روم میں ہوں، وضو کرتے ہوں، نہیں ملتے ، الماری کھول لوں ، پاپا کے کپڑوں میں پاپا کی خوشبو ہے بس خوشبو، خوشبو کو کیسے چھوؤں، خوشبو کی آواز کیسے سنوں، کیا کروں، پاپا نے اپنے رب کو ایسا لبیک کہا کہ مڑ کر بھی نہ دیکھا میں کتنی بے بس ہوں!

☆☆☆

باتیں اُن کی یاد رہیں گی

وہ جرمنی کی ایک سرد اور کہر میں لپٹی ہوئی دوپہر تھی ، میں اپنے شوہر کے ساتھ ویسبا ڈن کی ایک سپر مارکیٹ میں کچھ اشیاء کی خریداری میں مصروف تھی ، چونکہ رمضان المبارک کا مہینہ تھا تو جلد از جلد خریداری مکمل کر کے واپس ہوٹل جانے کا ارادہ تھا۔ہم ابھی کچھ اشیاء ہی خرید پائے تھے کہ دفعتاً موبائل کی بیل بجی، پاکستان کا نمبر موبائل اسکرین پر دیکھ کر دل کچھ عجیب انداز میں دھڑک اُٹھا، میرے دیور رضوان نے انتہائی غمناک لہجے میں جو خبر دی وہ میں نے اپنے شوہر کو بھی سنا دی کہ ہمارے پیارے خالو ہمیں داغ مفارقت دے گئے ہیں۔

میرے خالو سرانیس الرحمٰن (اصلی پری دھاگہ والے) دہلی پنجابی سوداگران برادری کے مایہ ناز سپوت، ایک انتہائی معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے،

مجھ سے انہوں نے بلکہ سب سے ہی ہمیشہ انتہائی شفقت آمیز رویہ رکھا وہ واقعی اس قابل ہیں کہ ان کی زندگی کے بعض گوشوں کو سب کے سامنے لایا جائے۔

خالو ایک انتہائی زندہ دل،خوش مزاج،منکسر المزاج، بذلہ سنج،خوفِ خدا سے معمور دل رکھنے والے اور سنت پر عمل پیرا فرد تھے، ہم نے ہمیشہ اُنہیں سفید کرتا شلوار، سفید ٹوپی اور لمبی داڑھی میں ہی دیکھا، چونکہ ایک ہی برادری سے تعلق تھا تو میں نے شادی سے پہلے بھی اُن کے بارے میں جیسا دیکھا اور سنا تھا بعد میں ایسا ہی پایا۔

خالو کی شخصیت میں بے تحاشا خوبیاں تھیں ۔ ہر ایک سے انتہائی خوش ہو کر ملتے ،سلام میں پہل کرتے ،صبح کی واک خالو کا طویل عرصے معمول رہی ، ہر آتے جاتے فرد کو سلام کرتے ، ہر جگہ جانے اور آنے کی دعائیں بلند آواز سے پڑھتے تا کہ بھولے ہوئے کو بھی یاد آجائے اور وہ بھی دعا پڑھ لے۔تکبر سے کوسوں دور تھے، ہر ایک سے احترام سے بات کرتے ،ڈرائیور اور گھریلو ملازمین کو بھی ساتھ میں صاحب کا لاحقہ لگا کر بات کرتے تھے ، اچھے کھانے اور کھلانے کے شوقین تھے، ہماری ذرا سی محنت کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے اور خوب تعریف کرتے ،ذرا سی تکلیف پر بے انتہا فکرمندی کا اظہار کرتے ، میں چونکہ سعودیہ میں مقیم ہوں تو ہمارے گھرانے کی ذرا سی تکلیف یا پریشانی کی اطلاع پانے پر فوراً مجھے یا میرے شوہر کو فون کرتے ،علاج بتاتے ، یا اگر پاکستان سے کسی دوا وغیرہ کی ضرورت ہوتی تو بھیجنے کا فوری انتظام کرتے ، ڈاکٹروں سے مشورہ کر کے رائے دیتے ،صبر کی تلقین کرتے اور فوراً یہی کہتے کہ اللہ پر بھروسہ رکھو ہم بھی دعا کر رہے ہیں تم بھی دعا کرو، ایک دفعہ میرے شوہر سخت بیمار

ہوئے تو خالہ کو ہمراہ لے کر 10 دن کے اندر جدہ آ گئے ، بہت حوصلہ اور تسلیاں دیں ۔ میرے بیٹے عبداللہ کی آنکھ کے اوپر چوٹ لگی تو دن میں کئی مرتبہ فون کرتے ، خالو کو انجکشن لگانا بھی آتا تھا جب کسی کو گھر میں انجکشن لگوانا ہوتا اُس کے پاس پہنچ جاتے ، نہ احسان جتاتے نہ اپنی کسی تکلیف کا تذکرہ کرتے ، بلکہ موقع محل کے لحاظ سے احادیث سنا کر حوصلہ بڑھاتے ۔

عاجزی کا پیکر تھے ۔ اگر ہم پاکستان جاتے تو اپنا ڈرائیور ہمیں بھیج دیتے اور خود کسی اور کے ساتھ آفس سے گھر چلے جاتے اور کبھی احسان نہ جتاتے ، کوئی چیز کھانے کو دل چاہتا تو جب خالو کو پتہ چلتا تو بھجوا دیتے ۔ جدہ آتے تو سنت کے مطابق تحائف دینے میں خوشی محسوس کرتے ، دعاؤں کی کتابیں ، عطر وغیرہ معمول تھیں ۔ حرمِ کعبہ میں جاتے تو کئی لفافے ہاتھ میں ہوتے جو خاموشی سے وہاں کام کرنے والوں کو پکڑاتے جاتے ۔

بچوں سے بھی بہت شفقت فرماتے ، اور اپنی بیگم سے بہت عزت اور لگاؤ کا معاملہ رکھتے ۔ خالو ہمیشہ خالہ کو ''خاتون اول'' کہہ کر اُن کا رتبہ بڑھاتے ، اپنی بہو کو ہمیشہ بٹیا کہا کرتے کہ یہ ہماری بہو نہیں ''بٹیا رانی'' ہے ۔ خالہ کے گھر جا کر ہمیشہ ہمیں محسوس ہوتا کہ اپنے ہی گھر میں ہیں تو خالہ ہمیشہ یہی کہتیں کہ یہ سب تمہارے خالو کی اچھی عادات کی وجہ سے ہے اگر وہ ایسے نہ ہوں تو میں تم سب کے ساتھ اتنا اچھا معاملہ نہ رکھ سکوں ۔ ہمیشہ خالو چھٹیوں سے پہلے فون کر کے پوچھتے کہ کب آ رہے ہو تم لوگ؟ تمہاری خالہ دال بھرے پراٹھے اور آموں کا پروگرام بنا رہی ہیں یا پھر فارم ہاؤس بُک کرا رہے ہیں تم لوگ اپنے آنے کی تاریخ بتاؤ ۔ ہر موقع ہمیں ہمیشہ یاد رکھتے کہ ہمیں فخر اور محبت کا احساس رہتا تھا ۔

خالو طویل عرصے تک حج گروپ بھی لے کر مکہ ، مدینہ جاتے رہے ، اُن کے گروپ میں انتظام اور خیال اتنا اچھا ہوتا تھا کہ لوگ اُنہی کے گروپ میں جانے کی خواہش رکھتے ۔ خالو کی ایک بہت اچھی عادت ہر کسی کے خوشی ، غمی میں بھرپور شرکت تھی نہ صرف شرکت بلکہ تعاون اور بھرپور مدد بھی کرتے ۔

خالو خود بھی پڑھنے کے شوقین تھے اور میری کتابوں سے وابستگی بھی انہیں معلوم تھی جب بھی اُن کے گھر جاتی تو اگر کوئی نئی کتاب ہوتی تو دکھا کر پوچھتے کہ پڑھی ہے ؟ میرے اظہارِ شوق پر وہ کتاب تحفتاً دے دیتے ۔ بتول بھی شوق سے پڑھتے ایک دفعہ میری ایک تحریر بتول میں چھپی تو اُس ہی مہینے کا بتول اُن کے پاس نہ آ سکا ۔ اُن کو جب پتہ چلا تو مجھے خاصطور پر بتایا کہ ہم نے بتول والوں کو خط لکھا ہے کہ ہمیں اس مہینے کا بتول ضرور بھیجیں کہ ہماری بیٹی کا مضمون چھپا ہے ہمیں پڑھنا ہے ۔ کئی دنوں تک خالو کی اس محبت بھری گفتگو کا اثر میرے دل و دماغ پر رہا ۔ خالو کی ''اصلی پری دھاگہ'' کمپنی کا اشتہار بتول میں باقاعدگی سے چھپتا ہے ، گزشتہ برس کافی عرصہ جب میں نے اُنکا اشتہار نہ دیکھا تو شکوہ کیا کہ خالو کیا بات ہے ہمارے بتول کو اشتہار دینا کیوں بند کر دیا تو فوراً کہنے لگے کہ اُن کو خط لکھ دو یا میں کہہ دیتا ہوں کہ ہم سے رابطہ کریں ۔

وہ واقعی ایسے انسان تھے کہ جن کی کمی عرصے تک محسوس ہوگی، محفلوں کی جان اور افراد کے درمیان باہمی صلح کرانے والے ہر کسی کے ہمدرد و خیر خواہ پیارے خالو! انشاء اللہ اب آپ سے جنت کے باغوں میں ملاقات ہوگی، آنکھیں آپ کی جدائی سے غمناک ہیں، دل کو ابھی تک قرار نہیں آتا، لگتا ہے ابھی کہیں سے سامنے آجائیں گے اور زور سے سلام کر کے ہماری اداسی کو دور کر دیں گے مگر جانے والے کب واپس آتے ہیں، بس یادیں چھوڑ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی حسنات کو قبول فرمائے اور خالو جیسی نیکیاں ہمیں بھی کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

؎ وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

☆☆☆

تبدیلی

یادوں کا خزانہ انمول ہے۔ہم بچوں کے دلوں میں جو جگہ بناتے ہیں وہ ہمیشہ قائم رہتی ہے

بہت پرانی بات نہیں ہے یہی کوئی پانچ چھ برس پہلے جب میرے بچوں کی سکول لائف چل رہی تھی کتنا مصروف اور خوش کن ہوا کرتا تھا مارچ اپریل کا مہینہ۔ عجیب گہما گہمی اور چھوٹی چھوٹی مسرتوں سے بھرا ہوا مہینہ ہوتا تھا۔

مگر آج مجھے بھی بہت شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ ہم اپنی مصروفیات اور الجھنوں میں اتنے گم ہیں کہ دوسروں کی خوشیوں میں شامل ہونے کا وقت ہی نہیں اور اس سے ہوتا یہ ہے کہ ہم لوگوں کی یادداشت سے محو ہونے لگتے ہیں اور دوسروں کی نظروں میں اپنا وجود کھونے لگتے ہیں۔

چند دن پہلے جب میرے پوتے کا رزلٹ آیا نرسری کلاس کا تو بے حد خوشی کے ساتھ اپنی بہت ساری کوتاہیاں بھی نظر آ گئی۔ میرے بچے تو اب کالج یونیورسٹی کے دور میں ہیں اپنے اپنے وقت پر سب کے رزلٹ آتے ہیں خوشی بھی ہوتی ہے مگر وہ مسرتیں وہ مبارکبادیں اور محبتیں جو چند برس پہلے رزلٹ والے مہینے میں میسر تھیں وہ کہاں؟ میری عادت تھی کہ میں ہر ماہ گھر کے خرچ میں سے پیسے بچا کر بچوں کی چھوٹی چھوٹی چیزیں پن، ڈائریاں، پنسل باکس، ریزر، کلر مارکر، اسٹکر شیٹ اور اسی طرح کی بے شمار چیزیں دو ماہ پہلے ہی خریدنا شروع کر دیتی تھی۔ اپنے بچوں کے رزلٹ کے انتظار کے ساتھ بچوں کے دوستوں، کزنز اور پڑوسیوں کے ہم عمر بچوں کے رزلٹ کا بھی انتظار ہوتا تھا چونکہ بچوں کو پتا ہوتا تھا کہ رزلٹ والے دن انعام کی صورت میں کچھ نہ کچھ ضرور ملے گا تو بچے اکثر اپنی والدہ سے پہلے مجھے رزلٹ دکھانا پسند کرتے تھے۔ ہر بچہ پوزیشن ہولڈر نہیں ہوتا مگر پاس ہونے پر بھی اگر حوصلہ افزائی ہو تو خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ میں اسے لالچ نہیں معصوم محبت سمجھتی ہوں۔ چھوٹا سا تحفہ اس بچے کے دل میں آپ کی جو محبت اور عزت جگاتا ہے اور وہ چمک ان کی آنکھوں میں پیدا کرتا ہے کہ دنیا کا قیمتی کھلونا اور دولت اس کا مول نہیں ہو سکتی۔

اپنے بچوں کو مہنگے کھلونے اور ان کی فرمائش پوری کرتے ہوئے ضرور اپنے اردگرد نظر ڈالیں 200 یا 300 روپے خرچ کر کے آپ اپنے لئے وہ محبت اور خوشی حاصل کر سکتے ہیں جو بچوں کے دلوں میں ہمیشہ اچھی یاد کی صورت باقی رہتی ہے۔

میں خود بھی بھولی ہوئی تھی اپنے بچوں کے بڑے ہوتے ہی میں بھی بچوں کی دنیا سے کٹ گئی تھی اور یہ ندامت میرے لئے سبق بن گئی۔ جن بچوں کو میں پاس ہونے پر چھوٹی چھوٹی چیزیں گفٹ کیا کرتی تھی ان میں سے اکثر کی اب شادیاں بھی ہو گئی مگر حیرت کا شدید جھٹکا لگا جب ان

دنوں میں دو بچیوں سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے مجھے یاد دلایا کہ میں جب 6th میں پاس ہوئی تھی تو آپ نے مجھے جو سلور کلر پن دیا تھا وہ آج بھی میرے پاس ہے اور دوسری بچی کو اپنا وہ پنک ہیئر بینڈ بہت عزیز ہے جس پر چھوٹا سا بھالو بنا ہوا ہے وہ میں نے اسے شائد 5th کے رزلٹ پر دیا ہوگا۔ حیرت اور خوشی نے میرے دل کو شاد کر دیا ان بچیوں سے خون کا رشتہ نہیں فقط بچوں کے کلاس فیلو تھے مگر یادوں کا خزانہ جو انکے پاس ہے وہ انمول ہے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ہم جو جگہ بچوں کے دل میں بناتے ہیں وہ ہمیشہ قائم رہتی ہے ۔ہمیں خود بھی اپنے بچپن میں جو لوگ پیار کرتے تھے وہ کبھی نہیں بھولے۔

کسی کے دل میں گھر بنانے کے لئے بہت سی دولت نہیں بس محبت اور احساس کا جذبہ درکار ہے۔آج ہمیں پتا ہی نہیں ہوتا کہ کس کا رزلٹ کب اور کیا آیا؟

مگر پتا نہیں ترتیب میں کہاں کمی رہ گئی کہ ہماری نسل میں یہ جذبہ نظر نہیں آتا۔بس اپنی اولاد کے آگے کچھ اور نظر نہیں آتا ہزاروں روپے کے کھلونے انہیں وقتی خوشی دیتے ہیں مگر ابدی اور لافانی خوشی تو دوسروں کو اپنی خوشیوں میں شامل کر کے اور دوسروں کی خوشی میں شامل ہو کے ہی ملتی ہے ۔ہم اپنے بچو کو شیئر کرنا سکھاتے ہی نہیں بلکہ اگر دو بچے بھی ہیں تو انہیں الگ الگ چیز پکڑاتے ہیں کہ یہ تمہاری اور یہ اس کی ہے۔''ہماری'' تو ہمارے ذہنوں سے نکلتا جا رہا ہے اور یہی خرابی ہے۔''اپنی اپنی چیزیں اپنی اپنی دنیا'' ایک ہی والدین کی اولاد اپنی چیز بہن بھائیوں کو نہیں دیتے تو چچا، تایا ، ماموں، خالہ اور پھوپھیوں کی اولاد سے کیا شراکت کریں گے یا دوسرے کلاس فیلوز کو کیسے شامل کریں گے۔؟ یہ ہمارا قصور ہے کہ بچوں کو حقوق ادا کرنا نہیں سکھاتے اور سب سے کاٹ کر انہیں تنہا کر دیتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ محبت سیکھیں اور بانٹیں۔

☆☆☆

بچوں کی صحت وتندرستی

اکثر مائیں یہ شکایت کرتی ہیں کہ بچے کچھ نہیں کھاتے، بہت کوشش کرو تو محض فیڈر منہ سے لگائے پڑے رہتے ہیں۔ کم کھانے کی بنا پر یہ بچے بدمزاج، چڑچڑے اور ضدی ہو جاتے ہیں۔ یوں ڈانٹ ڈپٹ سے بڑھ کر پیٹنے تک کی نوبت آجاتی ہے۔ بچوں کی یہ حالت کوئی ایک دو دن میں نہیں ہوتی بلکہ اس کا آغاز چھ ماہ کی عمر سے ہوتا ہے اور قریباً پانچ سال کی عمر تک یہی کیفیت برقرار رہتی ہے۔ ٹونے ٹوٹکے یہاں تک کہ ڈاکٹروں تک سے رابطہ کیا جاتا ہے۔ جو بھوک لگانے والے شربت تجویز کرتے ہیں جن کے باقاعدہ استعمال سے کبھی کچھ فرق پڑتا ہے ورنہ پرانی حالت برقرار رہتی ہے۔

میں اس سلسلے میں جس نتیجے پر پہنچی ہوں اس میں ان ماؤں کو بھی شریک کرنا چاہتی ہوں جو مذکورہ کیفیت سے پریشان ہیں، پریشانی کی وجہ خود ہماری پیدا کردہ ہے۔ ہم اکثر اپنی سہولت کے پیش نظر بچوں کو ٹھوس غذا دینے کی بجائے فیڈر کے ذریعے ٹالتی ہیں اور پھر جب یہ عادت پختہ ہو جاتی ہے تو پھر شکایت اور ان کے تدارک کے لئے دوڑ دھوپ کرتی ہیں۔

اگر بچے کو چار ماہ کے بعد سے دودھ کے علاوہ کچھ ہلکی پھلکی ٹھوس غذا دینا شروع کی جائے تو کھانے پینے کی عادت پختہ ہوگی۔ ابتدائی طور پر انڈہ کچھ کم اُبالنے کے بعد بچے کو چمچے سے کھلایا جائے اس کے علاوہ اُبلا ہوا آلو، چاول، کھچڑی، سوجی کا حلوہ، چائے یا دودھ میں رس یا بسکٹ ڈال کر دینا چاہیے۔ اس سلسلے میں جس بات پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے وہ مختلف اقسام کی اشیاء دینے کے حوالے سے ہے۔ اپنی سہولت کے پیش نظر محض دو تین چیزیں منتخب کر لینے سے بچے کا جی اچاٹ ہو جاتا ہے۔ اگر مختلف چیزیں دی جائیں گی تو یقیناً اسے منفرد ذائقوں سے آشنائی ہوگی یوں کسی شے سے زیادہ اور کسی سے کم رغبت بھی پروان چڑھے گی۔

سادہ دال چاول کی کھچڑی بنانے کے بجائے اگر ایک چمچہ چاول اور ایک چمچہ دال پہلے بھون لی جائے اور پھر اس میں مرغی کے گوشت کا چھوٹا سا ایک ٹکڑا اور گھر میں موجود سبزیوں آلو، شلغم، گوبھی، مٹر، گاجر وغیرہ میں سے تھوڑی سی ملا کر ہلکی آنچ پر دیر تک پکانے سے ذائقہ دار بن جاتی ہے جسے بچے کے سامنے پیالے یا پلیٹ میں رکھ دیں اور خود کھلانے کے بجائے اسے خود کھانے کی ترغیب دیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اکثر مائیں خود کھلانے پر کوشاں رہتی ہیں اور بچہ منہ ادھر اُدھر پھیرتا ہے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہوتا ہے کہ بچہ کھاتے وقت کچھ نیچے اور کچھ کپڑوں پر گرائے گا اس طرح بلاوجہ کام بڑھے گا۔ مگر اس طرح بچے کی تربیت نہیں ہوتی۔

پھر اس کی جبلت میں خود کام کرنے کی خواہش بھی ہوتی ہے جسے آپ کی احتیاط پسندی پروان چڑھنے نہیں دیتی۔ حالانکہ اگر آپ بغور دیکھیں تو چھوٹے بچے کچن میں آ کر آٹا مانگتے اور خود روٹی بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ساتھ ہی کھلونوں میں موجود برتنوں میں مختلف چیزیں پکانے اور پیش کرنے کی فرضی کوشش بھی کرتے نظر آتے ہیں۔

بچے کو روٹی، پراٹھے، بسکٹ یا رس کا ٹکڑا دیں وہ کچھ کھائے گا اور بقیہ گرائے گا مگر اس سے اس کی عادت میں تقویت پیدا ہوگی جو مزید کچھ کھانے کی خواہش کو اُبھارے گی ۔ممکن ہو تو چھوٹے برتن، گلاس، پلیٹ، پیالہ وغیرہ اسے دیں اور خود ہی پانی پینے کی عادت بھی ڈالیں۔ ابتداء میں وہ گرائے گا، کپڑے گیلے کرے گا مگر جلد ہی بہتر طور پر پینے کا عادی ہو جائے گا۔

سال کے آٹھ مہینوں میں انواع و اقسام کے پھل مل جاتے ہیں جبکہ چار ماہ میں پھل ذرا کم ملتے ہیں ان میں بھی کیلا، سیب اور کھجور با آسانی سے دستیاب ہوتے ہیں۔ اگر آپ غور کریں تو مئی کے نصف سے آم آنے شروع ہوتے ہیں جس کے ساتھ ہی جون میں جامن، خوبانی، آلو چہ، لوکاٹ آ جاتا ہے۔ جون کے اواخر سے چیری، لیچی، اسٹرابیری اور جولائی کے اوائل میں آڑو اور انگور آنے لگتے ہیں۔ خربوزے اور تربوز کا بھی یہی موسم ہے۔ اگست کے اواخر میں سیب اور ستمبر کے اوائل میں پہلے سفید اور پھر قندھاری انار آنے لگتا ہے جس کے ساتھ ہی مٹھا، املوگ (جاپانی پھل) بھی آ جاتا ہے۔ اکتوبر میں فروٹر، نومبر میں موسمی اور دسمبر میں کینو آتا ہے۔ امرود اور بیر بھی اسی دوران نظر آتے ہیں۔ یوں مئی سے دسمبر تک پھل بڑی وافر مقدار میں مل جاتے ہیں۔ جنوری سے اپریل تک کیلا، سیب کھجور، امرود اور خربوزہ وغیرہ مل جاتے ہیں۔

موسمِ سرما کی آمد پر چلغوزے، مونگ پھلی، نمکین پستے، انجیر اور اخروٹ وغیرہ ڈرائی فروٹ کے طور پر دستیاب ہوتے ہیں۔ انواع و اقسام کے ان پھلوں اور خشک میوہ جات کے تذکرے پر بہت سی خواتین یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گی کہ ان میں سے اکثر بہت مہنگے ہوتے ہیں مگر اس کا بھی ایک بہتر حل یہ ہے کہ جو اشیاء آپکی قوت خرید میں ہوں انہیں خوب خریدیں لیکن جو مہنگی ہوں انہیں موسم کے دوران کم از کم ایک مرتبہ قلیل مقدار میں ہی خریدنے کا اہتمام کریں تاکہ آپ کے بچے کے جسم میں قدرت کی نعمتیں کم مقدار میں ہی سہی ضرور پہنچیں پھر ذرا سوچیں کہ ان پھلوں کے نہ کھلانے سے قوتِ مدافعت کم ہوتی ہے جو بیماریوں کو جنم دیتی ہے یوں علاج پر کثیر رقم اور سکھ چین برباد ہوتا ہے۔

جن اشیاء کا میں نے تذکرہ کیا ان میں چیری، لوکاٹ، لیچی، چلغوزہ، نمکین پستے وغیرہ مہنگے ہیں۔ مگر اتنے مہنگے بھی نہیں کہ آپ سال میں ایک مرتبہ قلیل مقدار میں نہ خرید سکیں۔ مثلاً چیری تیس سے پچاس روپے میں آدھا پاؤ مل جائے گی جس کے پانچ پانچ چھ چھ دانے آپ بچوں کو کھلا سکتی ہیں۔ لیچی چار پانچ روپے کی ایک مل سکتی ہے یوں ایک یا دو ضرور کھلائی جا سکتی ہیں۔ چلغوزے اور نمکین پستے پچاس سے سو روپے چھٹانک ملیں گے یوں چند دانے ہی سہی بچوں کو اس

کے ذائقے سے متعارف کرانے کے لئے خریدے جا سکتے ہیں ۔ممکن ہے اس طرح ان اشیاء میں موجود جسمانی ضرورت بھی پوری ہو سکے۔

دورانِ زچگی اگر کچی سونف،مصری، کچا ناریل اور اس کا پانی استعمال کیا جائے تو اس کے بھی بڑے مثبت نتائج سامنے آتے ہیں ۔خاص طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ بچے ذہین اور بہتر رنگ روپے کے ہوتے ہیں ۔تین سال کی عمر کے بچوں کو کبھی کبھار کچی سونف، کچا ناریل اور خشک ناریل وغیرہ بھی کھلانا چاہیے سب سے اہم دور جس میں بچے آپ کی توجہ کے سب سے زیادہ متقاضی ہیں سات ماہ سے اڑھائی سال کی عمر کا ہے۔اس عرصے میں دانت اور داڑھ نکلتی ہیں، بچے کے مسوڑھے پھول جاتے ہیں، وہ شدید تکلیف کا شکار، بد مزاج اور چڑ چڑا ہو جاتا ہے۔مسوڑھوں میں تکلیف کی بنا پر مسمساہٹ غالب ہوتی ہے جس سے چھٹکارا پانے کے لئے وہ ہر شے کو مسوڑھوں کے درمیان دباتا ہے جس میں مختلف کھلونے، اپنی انگلیاں اور دوسروں کی انگلیاں وغیرہ شامل ہیں ۔جس کے ردِعمل میں اکثر دست ہو جاتے ہیں اور بچہ کمزور اور لاغر ہونے لگتا ہے۔اس موقع پر صفائی کا خاص اہتمام کریں۔دست یا قے ہونے کی صورت میں نصف چمچہ سونف اتنا ہی خشک پودینہ اور ایک سفید الائچی ایک گلاس پانی میں خوب کھولا کر چھان کر رکھ لیں ۔ایک ایک چمچہ پلانے سے بہترین نتائج سامنے آئیں گے۔

عام حالات میں جب بھی بچوں میں دست کی شکایت ہو، او آر ایس (نمکول) کا استعمال شروع کر دیں۔اگر فوری طور پر نمکول نہ ملے تو ایک گلاس اُبلے ہوئے پانی میں ایک چٹکی نمک اور دو چٹکی چینی ملا کر دینا شروع کریں۔کبھی کبھی بچوں کو قبض کی شکایت ہو جاتی ہے ایسے موقع پر پانچ مُنقے ایک گلاس پانی میں اتنا ابالیں کہ پانی نصف رہ جائے۔اگر بچہ مُنقے کھالے تو بہت بہتر ورنہ پانی پلانے سے بھی بہتر نتائج سامنے آئیں گے۔بچے اکثر پیٹ میں درد کی شکایت کرتے ہیں اس کے لئے ناف کے گرد ہلکی سی وکس لگا دیں اور اگر ٹھنڈ کی شکایت ہو تو سینے پر وکس لگا کر خوب ڈھک کر رکھیں انشاءاللہ بہتری ہوگی۔

بچوں کو اپنا دودھ پلانے یا فیڈر دینے کے بعد اس بات کا یقین کر لیں کہ دودھ کے قطرے منہ سے نکل کر کانوں کی طرف نہ چلے جائیں کیونکہ کانوں میں دودھ چلے جانے پر انفیکشن پیدا کرتا ہے اور درد اتنا شدید ہوگا کہ بچہ رات کے وقت بالخصوص نہ خود سوئے گا نہ آپ کو سونے دے گا۔بچوں کے کان صاف رکھیں، ناخن بروقت کتر دیں اور انہیں دن میں کئی مرتبہ ہاتھ منہ دھونے کی عادت ڈالیں ۔ابتدا ہی سے بچوں پر توجہ دینے کے نتائج ان کی بہتر تربیت کا باعث ہوں گے جس کی بدولت وہ صحت مند، توانا اور تندرست رہیں گے۔

اس عمل کو ہمیشہ اپنائیں کہ بچے کو دودھ پلانے سے قبل ممکن ہو تو وضو کر لیں۔بسم اللہ پڑھیں اور اس دوران تلاوت کرتی رہیں اگر یہ ممکن نہ ہو تو حمدیہ کلمات سبحان اللہ، الحمدللہ، اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ وغیرہ ہلکے ہلکے ادا کریں۔بچہ مسکرائے تو ماشاءاللہ اور جب بھی اس کی طرف بڑھیں تو السلام علیکم

کہیں اور ہاتھ ملائیں ۔ اس عادت کا میں نے یہ نتیجہ دیکھا کہ بچے سلام کرنا زبان سے تو بعد میں سیکھتے ہیں مگر ہاتھ بڑھا کر ملانے کا اہتمام کرنے لگتے ہیں ۔ یہ اور ایسی ہی بے شمار عادتیں ہیں جو آپ کے بچے کو سچا مسلمان اور ایک کامیاب انسان بنانے میں مددگار ثابت ہوں گی انشاءاللہ ۔

☆☆☆

کچن کارنر

سرمئی مچھلی

اشیا: سرمئی مچھلی ایک کلو ، لیموں 4عدد ، ہلدی ایک کھانے کا چمچ ، اجوائن ¼ چائے کا چمچ ، بھنا سفید زیرہ ایک چائے کا چمچ (پیس لیں)، لال مرچ پسی ہوئی ایک کھانے کا چمچ ،گرم مصالحہ پسا ہوا، ایک چائے کا چمچ ،نمک حسب ذائقہ، انڈے 2عدد، ثابت دھنیا (موٹا کٹا ہوا) ایک چائے کا چمچ ، ادرک لہسن (پیسٹ) ایک کھانے کا چمچ ،بیسن ایک کھانے کا چمچ ، کارن فلور دو کپ ،تیل تلنے کے لئے ۔

ترکیب: مچھلی صاف کر کے اس کے ٹکڑے کر لیں ۔ اب اس میں لیموں کا رس لگا دیں ۔ اب تمام مصالحے ، انڈے ، ادرک لہسن اور بیسن ، یہ تمام اشیاء مچھلی پر لگا دیں ۔ کارن فلور کے علاوہ ۔ اب یہ مچھلی دو سے 3 گھنٹے کے لئے رکھ دیں ۔ اب گھی گرم کریں ایک ٹرے پر کارن فلور بچھا دیں ۔ اب مچھلی کے ٹکڑوں کو کارن فلور میں ڈپ کریں اور پھر گرم گھی میں فرائی کر لیں ۔ مزیدار مچھلی تیار ہے

اسپرنگ فرائیڈ فش

اشیا: مچھلی بغیر کانٹے والی ایک کلو، انڈہ ایک عدد، لیموں دو عدد، سویا ساس 2 ٹیبل سپون ،لہسن کچلا ہوا 5 جوئے ، کارن فلور آدھی پیالی ، ہرا دھنیا ایک پیالی ، بریڈ کرمبز آدھی پیالی ، مونگ پھلی کا تیل 2 ٹی سپون ، ہری پیاز (چوپ کی ہوئی) ایک پیالی ،شکر ایک چائے کا چمچ ، ہری مرچ 3 عدد، لال مرچ کٹی ہوئی 1 کھانے کا چمچ ،نمک حسب ذائقہ، گرم مصالحہ ایک کھانے کا چمچ ،ٹماٹر 1 (چوپ کیا ہوا)۔

ترکیب: کارن فلور ، بریڈ کرمبز انڈہ اور سویا ساس ان سب کو ہلکا سا پانی کا چھینٹا دے کر مکس کر لیں مچھلی کے حسب منشا قتلے کاٹ لیں اور ان پر لہسن ، نمک ، شکر ، آدھی لال مرچ اور ایک لیموں کا رس لگا کر آدھے گھنٹے کے لئے رکھ دیں ۔ پھر اس مچھلی کو کارن فلور والے میٹریل میں ڈبو کر ڈیپ فرائی کر لیں ۔ گولڈن براؤن ہونے پر نکال لیں ایک فرائی پین میں مونگ پھلی کا تیل ڈالیں اس میں پیاز ڈال کر فرائی کریں ۔ پھر ٹماٹر ڈال کر فرائی کریں ، پھر اس میں ایک ٹی سپون نمک ، باقی بچی ہوئی لال مرچ ، ہری مرچ ، چوپ کی ہوئی ہری پیاز ، ہرا دھنیا اور گرم مصالحہ ڈال کر فرائی کریں ۔ اس میں مچھلی کے قتلے رکھ دیں اور مصالحے میں اچھی طرح مکس کر دیں اور فوراً آگ سے اتار لیں ۔ مزے دار مچھلی تیار ہے۔

فش سوپ

اشیا: مچھلی کا گوشت ایک پیالی ، سرکہ 3 کھانے کے چمچ ، سویا ساس 2 کھانے کے چمچ ، پانی 3-2 جگ ،نمک حسب

ذائقہ، کالی مرچ 1 کھانے کا چمچ، ہری مرچ 2 عدد (چوپ کرلیں) گاجر 2 عدد (کدوکش کرلیں)، بند گوبھی کٹی ہوئی (ایک پیالی)، کارن فلور 1 پیالی، انڈے 2 عدد۔

ترکیب: مچھلی کے گوشت کو ہلکا سا نمک اور کالی مرچ ڈال کر اُبال لیں۔ جب اُبل جائے تو کانٹے الگ کرلیں۔ اب اس یخنی میں (جس پانی میں مچھلی کو اُبالا ہے) سرکہ، سویا ساس نمک، کالی مرچ اور مچھلی کے گوشت کے چھوٹے ٹکڑے کر کے ڈال دیں اور 3 جگ پانی ڈال کر پکنے دیں۔ گاجر چھیل کر کدوکش کرلیں۔ گاجر بھی شامل کر دیں۔ جب بڑے بڑے اُبال آنے لگیں تو انڈے پھینٹ کر ڈالیں۔ چمچہ برابر چلاتی رہیں۔ ہری مرچیں شامل کر دیں۔ کارن فلور کو پانی میں گھولیں اور تھوڑا تھوڑا کر کے سوپ میں شامل کریں اور سوپ میں چمچہ چلاتی رہیں۔ پھر اس میں بند گوبھی ڈال کر اُبال دیں اور گرم گرم سرو کریں۔

(عنزہ عثمان)

سوجی کی پنجیری

اشیا: سوجی ایک پاؤ، دودھ ایک پاؤ، چینی ایک پاؤ، سوکھا دودھ ایک پیکٹ، انڈے دو عدد، چھوہارے 10 عدد، سبز الائچی 5 عدد، پستہ، بادام، اخروٹ، کشمش حسب پسند، گھی ایک پاؤ۔

ترکیب: چھوہارے دودھ میں بھگو کر رکھ دیں۔ سوجی، چینی اور دودھ اس کو ملا کر مکسچر بنالیں جو نہ بہت پتلا ہو نہ بہت گاڑھا۔ اب کڑاہی میں تیل گرم کریں جب گھی اچھی طرح کڑکڑا جائے تو احتیاط سے سارہ آمیزہ اٹھا کر اس میں شامل کر دیں آنچ دھیمی رکھیں اب اسے پلٹے کی مدد سے بھونتی رہیں جب حلوہ سنہری مائل ہو جائے تو اس میں انڈے اور سوکھا دودھ شامل کر دیں تھوڑا اور بھونیں جب خوشبو آنے لگے تو اس میں چھوہارے اور باقی سب میوے شامل کر دیں اور اتار لیں۔

لاہوری حلوہ

اشیا: سوجی ایک پیالی، چینی ایک پیالی، زردا رنگ ایک چمچ، چھوٹی الائچی 5 عدد، زیرہ بھون کر پیس لیں 1 چمچ، بادام 10 عدد (بھیگے ہوئے) پستہ 20 عدد بھیگا ہوا۔

ترکیب: تیل میں الائچی اور زیرہ پاؤڈر ڈال کر گرم کریں پھر اس میں سوجی ڈال کر بھون لیں سوجی نکال لیں گھی میں پانی اور چینی ڈال کر شیرا بنالیں جب شیرا بن جائے تو اس میں بھنی ہوئی سوجی ڈال دیں اور زردا رنگ بھی شامل کر دیں جب پانی خشک ہو جائے اور حلوہ کڑاہی کو چھوڑنے لگے تو اسے ڈش آؤٹ کرلیں اور اوپر پستہ بادام ڈال کر سجا کر پیش کریں۔

(شازیہ مشتاق)

دلیہ سوپ

اجزا: دلیہ (تیار ڈبے والا جو یا گندم کا) ایک کپ، چکن، ایک پاؤ، کنور چکن کیوب آدھا حصہ، پیاز ایک عدد چھوٹا، نمک حسب ذائقہ، کالی مرچ پسی ہوئی حسب ذائقہ، پانی، آئل ¼ کپ۔

ترکیب: پیاز کو تھوڑے سے آئل میں براؤن کریں پھر نمک، کالی مرچ، کنور چکن کیوب اور چکن ڈال کر بھون لیں

پھر دلیہ ڈال کر بھونیں 5 منٹ بعد تقریباً 4 کپ پانی ڈال کر چکن کو اور دلیے کو گلا لیں ہلکی آنچ پر کہ چکن بالکل ریشہ ریشہ ہو جائے پھر حسب پسند پانی ڈال کر پتلا کر لیں یہ بچوں کی فیورٹ ڈش ہو گی اور مریضوں کے لئے طاقتور۔ ذائقے کے لئے دہی، لیموں یا چاٹ مصالحہ چھڑک سکتے ہیں۔

ٹوٹکے

۱۔ پھٹکری بہترین (Antiseptic) ہے اس کا سفوف واش روم میں رکھیں نہانے کے بعد بغلوں میں لگانے سے پسینے کی بدبو ختم ہو جاتی ہے اور یہ مسّوں کے خاتمے کیلئے اکسیر ہے دن میں تین مرتبہ مسّوں پر لگائیں آدھے گھنٹے بعد پانی سے دھولیں بڑے مسّے جھڑ جائیں گے اور چھوٹے غائب ہو جائیں گے آزمایا ہوا نسخہ ہے۔

۲۔ اگر کوکر بہت زیادہ جل جائے یعنی سالن پیندے پر لگ جائے تو اس میں دو گلاس پانی ڈالیں ایک چمچ میٹھا سوڈا اور ایک پیاز کاٹ کر ایک دو ابال آنے دیں پھر چمچ سے اتار لیں آسانی سے لگا ہوا سالن اتر جائے گا اور کوکر صاف ہو جائے گا۔

(مہوش احسان۔ لیہ)

☆☆☆

محشر خیال

ڈاکٹر نزہت اکرام ۔ لاہور

اس بار ابتدا تیرے نام سے خوں نابۂ دل ہی بن گیا اتنے خونچکاں واقعات وحادثات جمع ہو گئے کہ دنیا ماتم خانہ نظر آنے لگی اور پھر بیاں اپنا! حج اور زکوٰۃ پر مبنی مضامین معلومات افزا ہیں ۔ڈاکٹر گوہر مشتاق کا ایک جائزہ الیکٹرانک میڈیا پر چشم کشا ہے کاش کہ اس میٹھے زہر سے بچنے کی مہم شروع ہو جائے اور نسل نو کی اخلاقی ہلاکت کا سد باب ہو سکے غزلیات کا انتخاب اچھا ہے ۔افسانے حسب معمول سبق آموز اور دلچسپ ہیں ۔ ماسی صغراں کی لگن اور کردار کو عظمیٰ عمران نے خوب صورتی سے تحریر کیا ہے مثنا یاد کا ''پنجرے میں بسیرا'' ملک کی لوٹ مار کی روش اور اخلاقی تنزلی کا عکاس ہے، قانتہ رابعہ نے نورین کی نفسیات اور خواہش پر روشنی ڈالی ہے ۔محمد سہیل احمد اور عائشہ عثمان نے اپنے پاکیزہ کردار والدین کے عظیم کردار کو دلسوزی سے تحریر کیا ہے عظمیٰ صدیقی نے بھی والدہ کی علالت اور اپنے ایمان واطمینان کو سنجیدگی سے موثر طریق پر پیش کیا ہے ساجدہ رفیق نے ہاتھ اور دعا کے عنوان سے امراض قلب کے شکار بچوں کے علاج کی سہولتوں کے لئے خواب دیکھا ہے کاش اس کی تعبیر ممکن ہو۔

داستان عطاو بخشش ڈاکٹر ثمین ذکا کی حیات کے نشیب و فراز کا مظہر ہے یہ سلسلہ وار داستان مختلف حقائق اور داستانوں پر مشتمل سادہ انداز میں بیان کردہ تحریر ہے جو ڈاکٹر صاحبہ کی قوت مشاہدہ، انسانی ہمدردی اور ہمت پر دالّ ہے

بشریٰ تسنیم کا مضمون ''اللہ کے نام سے ابتدا'' توہمات، بدعات اور شرک پر مبنی خیالات کے خلاف جہاد اور تعلق باللہ کی دعوت دیتا نظر آتا ہے۔

پچھلے دوشماروں سے چلتے چلتے کی رونق نظر نہیں آ رہی کیا فرزانہ چیمہ صاحبہ خدانخواستہ علیل ہو گئی ہیں ۔ پہلے کبھی ایسا تعطل نہیں ہوا۔

اس بار بتول بہت لیٹ ہو گیا کیا وجہ ہوئی ؟انتظار مشکل ہو جاتا ہے ۔میری اپنی بھی طبیعت بیکل رہتی ہے عوارض بڑھتے چلے جاتے ہیں نا،اور ملکی حالات زیادہ پریشان کن ہیں۔اللہ کریم اس قوم پر رحم فرمائے۔

صائمہ نورین بخاری ۔ ملتان

طویل غیر حاضری کی معذرت چاہتی ہوں ۔ آپ کی دعاؤں سے عمرے کی سعادت حاصل کی اور متحدہ عرب امارات کا تعلیمی وتفریحی سفر مکمل کیا۔ یہاں پر اس دوران ''چمن بتول'' باقاعدگی سے ملتا رہا......مگر مصروفیت کے باعث مکمل مطالعے کا موقع نہ مل سکا۔ اب جیسے ہی فراغت پائی سوچا پہلی فرصت میں آپ کے ستمبر کے اداریے کی تعریف کر ڈالوں ۔ جس دردمندی سے آپ نے ہماری قوم کے صبر و برداشت کی

تعریف کی وہ قابل ستائش ہے۔کاش ہم ایک قوم ہو کر اپنے مسائل کا حل نکال سکیں۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ ہم سب نے ''نا اتفاقی'' پر اتفاق کر لیا۔ہے اسی لئے بیرونی طاقتیں ہماری عزت نفس مجروح کرنے کے در پے ہیں اور اندرونی طاقتیں رہی سہی عزت کی دھجیاں بکھیرنے پر آمادہ .....کچھ سمجھ نہیں آتی کیا ہوگا،کوئی غیبی طاقتیں اس ملک کو سیدھا کرنے کے لئے اتریں گی یا معجزہ خداوندی ظہور پذیر ہوگا۔جو ہو خدا بہتر کرے۔آمین بنتِ مجتبیٰ مینا کی وفات کا صدمہ گہرا ہے ۔وہ علم و روشنی کا استعارہ تھیں۔اللہ تعالیٰ انہیں اپنی جوارِ رحمت میں بلند مقام عطا فرمائے آمین۔

انشاءاللہ آپ سے قلمی تعاون جاری رہے گا۔☆☆

بتول میگزین

فرض

(ڈاکٹر ممتاز عمر)

میں نے گاڑی روکی اور دروازہ کھول کر باہر آ کھڑا ہوا ۔نوجوان اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے ابھی تک اوپر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بالکونی میں اس کی بیوی سال سوا سال کے بچے کو گود میں لئے کھڑی تھی، مسکراہٹوں کا تبادلہ ہو رہا تھا ، بچہ مچل مچل کر ماں کی گود سے نکل جانے کو آمادہ تھا جبکہ باپ نیچے سے بار بار اسے ''ٹاٹا'' کہہ کر ہاتھ ہلانے کی ترغیب دے رہا تھا۔ یہ منظر بہت ہی خوش کن تھا۔ میں شدید اضطراب و بے چینی میں گاڑی روک کر اس سے باہر نکل آیا تھا ۔ اسی دوران نوجوان نے موٹر بائیک کو ایکسیلیٹر دیا پھر ایک آواز آئی ''نومی کو دیکھئے'' وہ پھر رک گیا۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا آگے بڑھ کر میں نے نوجوان کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ غیر متوقع دباؤ کو محسوس کرتے ہوئے وہ خوفزدہ سا میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا اگر آپ کے پاس چند منٹ ہوں تو گاڑی بند کر کے میری بات سن لیجئے ۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بڑی بیزاری سے آمادہ ہو گیا اور پھر میرے کہنے پر اس نے اپنی بیوی کو بھی نیچے آنے کا اشارہ کیا ۔ جب اس کی بیوی دروازے پر آ کھڑی ہوئی تو میں گویا ہوا ایک نصیحت ہے جسے کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں آپ دونوں تو ایک دوسرے کو رخصت کرنے میں اتنے محو تھے کہ میری طرف توجہ نہ کی لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ میں کئی منٹ سے کھڑا آس و یاس کی سولی پر لٹک رہا ہوں ۔آپ دونوں کی چاہتیں خوب ہیں اللہ ان کو اور بڑھائے مگر اس ننھی جان کا کیا قصور ہے جو ابھی خوف و خطر کے احساس سے عاری ہے ۔ یہ محض چابی کے کھلونے کی طرح ہے جو آپ کے اشاروں پر متحرک ہے ۔ اسے اپنے اچھے برے کا کچھ پتہ نہیں اگر اس کے سامنے ایک برتن میں دہکتے انگارے اور دوسرے میں چمکتے نگینے رکھ دیے جائیں تو ان میں فرق کیے بنا انگاروں کی طرف تیزی سے لپکے گا۔

میں نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا میرے بھائی ! تمہیں میری یہ دخل اندازی گراں تو گزر رہی ہو گی مگر جس خوف سے میں لرز گیا اس کا اندازہ تمہیں نہیں ہو سکتا ۔ ابھی چند روز پہلے کی بات ہے میرا چھوٹا بھائی بالکل تمہاری طرح بائیک لئے نیچے کھڑا تھا۔ اس کی بیوی بھی بالکل تمہاری بیوی کی طرح بچے کو گود میں لئے بالکونی میں کھڑی شوہر کو الوادع کہہ رہی تھی ۔ بچے نے ہاتھ ہلاتے ہلاتے اچانک کچھ زیادہ زور لگایا اور تیزی سے زمین کی طرف آ رہا۔

چیخ و پکار اور نالہ و فریاد کی صدائیں اتنی تھیں کہ محلے بھر

میں کہرام مچ گیا۔ میں اسی گاڑی میں بچے کو ہسپتال لے گیا بچہ زندہ تھا مگر بے حس وحرکت سی ٹی سکین دیکھ کر ڈاکٹر کا چہرہ تغیر پذیر ہوا اور پھر چھ گھنٹے بعد ہم اُس معصوم کی لاش لے کر گھر پلٹے۔کئی دن گزر گئے مگر میری بھابھی عجیب دیوانوں کی سی حرکتیں کرتی ہے کہتی ہے کہ میں کیوں نہ ننھے کے ساتھ گر گئی اور اکثر وہیں جا کھڑی ہوتی ہے۔ میں نے اگلے دن وہاں گریل (Girl) لگوا دی ہے تا کہ آئندہ کسی حادثے سے بچا جا سکے۔

تو بھائی یہ تھی میری درخواست، جسے میری التجا بھی سمجھو اور پھر میں نے اس کی بیوی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا میری بہن چند سیڑھیاں ہی تو اُترنی ہیں تم نیچے دروازے تک آ کر اپنے شوہر کو رخصت کیا کرو۔ وہ دونوں میری گفتگو سن کر بے حس وحرکت کھڑے تھے، بچہ ماں کے کاندھے سے سر ٹکائے نیند کی آغوش میں جا چکا تھا۔ میں گاڑی کی طرف آیا، بیٹھا اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا، اب میرا دل خاصا ہلکا تھا اس خیال سے کہ میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔

میڈیا کا میٹھا زہر

(ارم آصف صدیقی۔ریاض سعودی عرب)

آج جس مسئلے کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتی ہوں، وہ ہمارے معاشرے میں پھیلتا ہوا ''میڈیا کا میٹھا زہر'' ہے۔

آج سے پندرہ سولہ سال پہلے بھی وطن عزیز میں اس میڈیا کا وجود تھا لیکن کسی حد تک حکومتی اداروں کے قابو میں ہونے کی وجہ سے اور شاید اُس وقت کے ارباب اختیار میں اخلاقی پابندی کا احساس باقی ہونے کی وجہ سے اس میڈیا نے ایک بے لگام گھوڑے کی شکل اختیار نہ کی تھی۔ مگر پچھلے آٹھ دس برسوں میں جس طرح ایک باقاعدہ منصوبہ بندی کے ذریعے عوام کے ذہنوں کو مسموم کیا جا رہا ہے آج اُس کے نمایاں اثرات ہمارے معاشرے پر نظر آتے ہیں۔ وہ پاکستانی عوام جو انا ؤنسر کے سر سے دوپٹہ اتر جانے پر شور مچا دیا کرتے تھے آج بے حیائی کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ کھلے عام گھریلو معاملات، ازدواجی رشتوں کی نزاکتیں، نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے رومانس، اپنے خاندان والوں کے ساتھ بیٹھ کر بے حسی کے ساتھ دیکھتے رہتے ہیں۔

پڑوسی ملک کی نقالی میں ہمارے ٹی وی چینلز اس قدر دیوانگی اختیار کر چکے ہیں کہ اپنی تہذیب وثقافت تو شاید انہیں یاد ہی نہیں رہی ہے۔ اے آر وائی ہو، ہم ٹی وی، پی ٹی وی یا جیو انٹرٹینمینٹ جس چینل کو کھولیے اور جب کھولیے۔ ہر شخص چاہے وہ بچہ ہو کہ بوڑھا، مرد ہو کہ عورت آپ کو ناچتا گاتا ہوا ہی نظر آئے گا گویا کہ یہ ناچ گانا جو کہ ہندوؤں کی تہذیب کی عکاسی کرتا ہے آج ہم نے اسے اپنا لیا ہے اور یہی وہ میٹھا زہر ہے جو نوجوان نسل کے ذہن میں آہستہ آہستہ سرایت کر رہا ہے۔

ہماری آج کی نوجوان نسل غیروں کا سا لباس پہننے، اُن کے انداز میں بولنے میں فخر محسوس کرتی ہے۔ ہمارے معصوم بچے اب معصوم نہیں رہے ہیں۔ cartoon network اور اسی قسم کے دوسرے زہریلے چینلز نے انہیں نا فرمان اور بدتمیز بنا دیا ہے۔ سب سے بڑھ کر جو نقصان ہمیں

اس میڈیا نے پہنچایا ہے وہ یہ کہ ہم اپنے رب کی یاد سے غافل ہوگئے ہیں۔

ٹوٹتا ہوا آج کا خاندانی نظام (حصہ دوم)

(ڈاکٹر عذرا یاسمین۔ریاض سعودی عرب)

آج کا خاندانی نظام ہمارا روایتی یا معاشرتی خاندانی نظام ہے جو مشترکہ خاندانی نظام پر مشتمل ہے۔ اس کی مضبوطی کا انحصار ''واتقوااللہ'' ہے جب تک اللہ کا خوف دلوں میں رہتا ہے یہ نظام مضبوط رہتا ہے اور جب یہ خوف دلوں سے نکل جاتا ہے اس میں دراڑیں پڑنا شروع ہو جاتی ہیں اور بالآخر وہ کمزور ہو جاتا ہے، شیطان ازل سے انسان کا دشمن رہا ہے اور جہاں بھی اس کا وار چل گیا اس نے ہمیں ہمارے فرائض منصبی سے ہٹا کر ہر فرض سے آزاد کر دیا۔ کہیں ''آزادیٔ نسواں'' کا پر فریب نعرہ لگا کر، کہیں ''مساوات مرد وزن'' کے خواب دکھا کر ہمارے مضبوط خاندانی نظام پر شب خون مارا، فرائض سے ہٹا کر حقوق کی جنگ میں الجھا دیا۔ خاندانی نظام کے مضبوط ستون عورت کو بازار میں لا کھڑا کیا، وہ عورت جو گھر میں مطمئن اور بچوں میں مگن تھی اب ان کی پیدائش و تربیت اس کے لئے بوجھ بن گئی۔ مرد کو بے سکون کر دیا، بوڑھے والدین اور ان کی نصیحتیں شاق گزریں اور وہ اولڈ ہوم کی طرف دھکیل دیئے گئے بچے غیر مسلم یا اسلام سے نابلد آیاؤں کے سپرد کر دیئے گئے۔ نوجوان نسل باغی ہوگئی، والدین دشمن اور غلط صحبتیں اور عادات دوست بن گئیں۔غرض مغرب کے مادہ پرست، زر پرست، ہوس پرست اور اخلاق سے محروم معاشرے سے متاثر ہو کر آج ہمارا مضبوط و مربوط خاندانی نظام بکھرنے لگا ہے ہمیں اس کو بچانے کے لئے ہادیٔ برحق ﷺ کے چند اصول اپنانے ہوں گے

☆ کسی سے خوش ہوں یا ناراض انصاف کی بات کروں۔

☆ جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں

☆ جو مجھے محروم کرے میں اُسے دوں

کائنات پر غور و فکر

(اُمِ صائم۔لاہور)

پچھلے دنوں میرا ایک پارک میں جانا ہوا وہاں مالی پودوں کی کانٹ چھانٹ کر رہا تھا۔اُس کی اس تراش خراش اور کانٹ چھانٹ نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

جو پھول بہت خوبصورت اور کھلے ہوئے تھے اُن کو وہ بہت پیار سے ہاتھ لگا رہا تھا۔کچھ مرجھائے ہوئے تھے ان کی طرف بھی وہ بہت توجہ دے رہا تھا۔اُن میں کھاد وغیرہ ڈال رہا تھا جو بالکل ہی سڑ گئے انہیں بحالت مجبوری وہ جڑ سے نکال کر پھینک رہا تھا۔

تو یہ سب دیکھتے ہی میرا ذہن قرآن کی اس آیت کی طرف چلا گیا۔میری نشانیوں پر غور کرو۔

اور میرا ذہن سوچتا ہی چلا گیا کہ اگر ایک مالی اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے پودے کا اتنا خیال رکھتا ہے تو وہ اللہ جو ہمارا رب ہے جس نے ہمیں پیدا کیا وہ اپنے بندوں کا خیال کیوں نہ رکھے گا۔

جیسے ایک خوبصورت پودے کی طرف مالی کی توجہ زیادہ

ہو جاتی ہے وہ اُس کی زیادہ دیکھ بھال کرتا ہے تا کہ اُس کی یہ خوبصورتی قائم رہے کیونکہ اس پودے کی وجہ سے اُس کے باغ کی رونق ہے۔ اسی طرح اگر دنیا میں کوئی نیک عمل کرتا ہے اور اس دنیا کو اللہ کے دین کی خوشبو سے مہکاتا ہے تو کیا وہ اللہ اُسکا خیال نہ رکھے گا کہ وہ اس کی دنیا میں اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا رہے۔

دوسری طرف اگر کوئی پھول مرجھا رہا ہو تو بھی مالی اُس کی طرف زیادہ توجہ دیتا ہے کہ شاید اُس کی دیکھ بھال میں کوئی کمی رہ گئی ہے وہ اُس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے تا کہ وہ پھول مرجھانے سے بچ جائے۔

اسی طرح جب اللہ پاک اپنے کسی بندے کے کسی عمل میں کوئی کمی دیکھتا ہے تو اُس پر ایک فرشتہ مقرر کر دیتا ہے تا کہ اس کے دل تک جو بات نہیں پہنچ رہی وہ اس کے دل تک پہنچے۔

ہاں اگر کوئی پھول پودا بالکل ہی مرجھا جائے، سڑ گل جائے جو مالی کی محنت کے باوجود اپنی نشوونما کے لئے کسی چیز کو قبول نہیں کرتا تو مجبوراً مالی کو وہ پودا جڑ سمیت نکال کر پھینکنا پڑتا ہے۔

اور یہی حال ہم انسانوں کا ہے کہ جب ہم بالکل ہدایت کی طرف سے منہ پھیر لیتے ہیں کان اور دل بند کر لیتے ہیں اور کسی کی لاکھ کوشش کے باوجود بھی کچھ حاصل نہیں کرتے تو پھر ہمارے دلوں پر بھی مہر لگ جاتی ہے اور مجبوراً اللہ پاک اس کی طرف سے منہ پھیر لیتے ہیں اور اُس کا ٹھکانہ عِلّیّین سے ہٹا کر سجین میں لکھ دیتے ہیں۔

کیونکہ اللہ پاک فرماتے ہیں یہ میری سنت نہیں کہ میں ہاتھ پکڑ کر کسی کو راہ ہدایت دکھاؤں۔

اپنے بچوں کی بچپن کی یادیں بنائیے

(عظمیٰ آفرین۔ کراچی)

وہ بھی کیا دن تھے جب کوئی فکر، کوئی پریشانی، کوئی غم نہیں ستاتا تھا، چھوٹی سی ایک کہانی بھی خوش ہونے کا باعث بن جاتی تھی لیکن آج کل کے بچوں کا بچپن ہم بڑوں سے کتنا مختلف ہے آج کے دور میں ماں باپ اپنی حیثیت کے مطابق بچوں کو ہر قسم کی سہولتیں دیتے ہیں، جن میں علیحدہ کمرے، کمپیوٹر، ویڈیو گیمز، ٹی وی وغیرہ شامل ہیں لیکن حیرانی یہ ہے کہ ان سب چیزوں کے باوجود بچے خوش نہیں رہتے چھوٹے چھوٹے بچوں کی روٹین اتنی سخت ہوتی ہے کہ اس میں کسی قسم کی تفریح کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی ماں باپ کی ساری توجہ بچوں کی تعلیم پر مرکوز ہوتی ہے۔ بچہ اسکول سے آنے کے بعد ایک آدھ گھنٹہ آرام کرتا ہوگا کہ قاری صاحب آجاتے ہیں یا بچوں کو مدرسے جانا پڑ جاتا ہے، پھر بچہ ٹیوشن پڑھنے چلا جاتا ہے جس کے بعد وہ اتنا نڈھال ہو جاتا ہے کہ وہ بمشکل ہوم ورک کرتا ہے عموماً بچے کھانے کے دوران ہی سو جاتے ہیں دوسرے دن پھر وہی معمولاتِ زندگی۔ یہ حقیقت ہے کہ آج کل کے سکول کا نصاب بہت زیادہ ہے جسے مقررہ مدت میں پورا کرنا مشکل ہوتا ہے۔ بچپن جو زندگی کا سب سے خوبصورت دور ہوتا ہے اس میں تھوڑی سی آزادی اور بے فکری تو ہونی ہی چاہیے آج کل کا ماحول ایسا ہے کہ خاص طور پر بڑے شہروں کی مائیں اپنے بچوں کو گھر سے باہر کھیلنے نہیں

دیتیں۔ایسی صورت میں کیا کیا جائے۔

سب سے پہلے تو پڑھی لکھی مائیں کوشش کریں کہ جہاں تک ممکن ہو سکے بچوں کو خود پڑھائیں، ٹیوشن پر نہ بھیجیں اس لئے کہ جتنی توجہ اور ذمہ داری سے ایک ماں اپنے بچوں کو پڑھا سکتی ہے دس بارہ بچوں میں گھری ٹیچر نہیں، یہاں پر میرا مطلب کسی ٹیچر کی دل آزاری کرنا نہیں ہے۔جس سے آنے جانے کا وقت بھی بچے گا، ہوم ورک بھی جلدی ہو جائے گا اور بچے کیلئے کھیل کود کا وقت بھی نکل آئے گا۔لیکن موجودہ دور میں اعلیٰ تعلیم یافتہ مائیں بھی نرسری اور کے جی کے بچوں کو ٹیوشن پر بھیج کر اپنی ذمہ داریوں سے بری الذمہ ہو جاتی ہیں کیا فائدہ ایسی تعلیم کا جو آپ نے حاصل کی ہو اور آپ کے بچوں کے کام ہی نہ آ رہی ہو۔چھٹی کے دن بچوں کو قریبی پارک لے جائیں یا قریبی عزیز و اقارب کے بچوں کے ساتھ ملنے جلنے اور کھیلنے کے مواقع فراہم کریں۔ضروری نہیں کہ تفریح کے لئے بہت سارا پیسہ خرچ کیا جائے،بس خوش رہنے اور خوش رکھنے کا جذبہ ہونا چاہیے۔

شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے میری بات

(عمارہ احسن لاہور)

اذیت، مصیبت، پریشانی یا دکھ تعلیمی زندگی میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔اس کا تعلق صرف کامیابی کے حصول سے ہوتا ہے۔محنت اور کامیابی کا آپس میں گہرا تعلق ہے یعنی محنت کی ہو تبھی کامیابی کی توقع کی جاتی ہے اور اگر یہ تعلق راست متناسب ہونے کی بجائے اُلٹ ہو جائے تو اذیت، مصیبت، دکھ اور پریشانی جیسی چیزیں ایک طالب علم کی زندگی میں کوئی معنی رکھنا شروع ہو جاتی ہیں۔

پاکستان میں بہت سے نوجوان شاید اس قسم کی اذیت، مصیبت، دکھ اور پریشانی کا سامنا کرتے ہیں یعنی محنت کے باوجود کامیابی نہیں پاتے۔ان کی محنتوں کو صحیح سمت اور درست طریقہ کار دینے کی ضرورت ہے۔کیا ہمارے اساتذہ کرام اپنا یہ فرض نبھائیں گے؟

انسان کامیابی کی جستجو میں بھاگتا چلا جاتا ہے۔حتیٰ کہ وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔وہ واقعی لوگوں کو کسی فرشتے کی مانند لگتا ہے۔ایک چاہے جانے والا شخص.....ایک رشک کئے جانے والا شخص، ایسا شخص خود کو کہلانا بڑی عظیم بات لگتی ہے۔بعض اوقات لگتا ہے کہ اُس سے بڑھ کر کچھ نہیں .....اس کے لئے بھی کبھی کوئی مشکل چیز مشکل ہو سکتی ہے؟ اسے..... اسے کچھ مشکل لگے..... ناممکن! سب مجھ سے پوچھیں..... سب مجھے دیکھیں..... میں بتاتا ہوں ہر مشکل کا جواب..... بھئی ٹھیک ہے نا..... جب انسان اتنا ذہین ہو تو اتنا اعتماد تو اسے ہونا چاہیے نا.....!

لیکن یہی ہواؤں میں اڑتا ہوا انسان ٹھوکر کھا کر تب گرتا ہے جب اس کی منزل محض دو قدم کے فاصلے پر ہوتی ہے.....تب جب اسے خود سے بڑھ کر کچھ دکھائی نہیں دیتا۔تب جب ساری دنیا وہ اپنی نظر میں تسخیر کر چکا ہوتا ہے۔تب جب دنیا اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

آپ کیا اندازہ لگا سکتے ہیں ایک ایسے شخص کے بارے میں جو میڈیکل کے فائنل ائیر میں محض ایک ٹریفک حادثے کی وجہ سے اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے۔علم، قابلیت، ڈگری

کامیابی ، ہواؤں میں پرواز..... یہ سب کچھ اسے تحلیل ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ اگر کچھ بچتا ہے تو صرف پچھتاوا.....احساس ندامت .....عاجزی .....عبرت کا نشان .....اس کے علاوہ سب کچھ مٹ جاتا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں بچتا تب!!

☆.....☆.....☆

کیا ضمیر کی آواز کبھی چپ ہوسکتی ہے؟

ضمیر کیا ہوتا ہے؟

ضمیر دراصل انسان میں موجود ایک ایسا الارم ہوتا ہے جو اس وقت بجتا ہے جب انسان کوئی غلط کام کرے۔ انسان چاہے خود کو بظاہر کتنا بھی مطمئن کیوں نہ کرلے لیکن اس کا ضمیر صحیح اور غلط کی پہچان رکھتا ہے اور ہر غلط کام پر ایک تنبیہہ ضرور دیتا ہے اور اگر یہ الارم بند ہو جائے تو سمجھ لو کہ انسان مر چکا ہے۔ صحیح اور غلط کی تمیز اللہ تعالیٰ ہر انسان کے دل میں ڈال کر بھیجتا ہے لیکن انسان عمر کے اضافے کے ساتھ ساتھ برائیوں میں بھی اضافہ کرتا چلا جاتا ہے اور اپنے ضمیر کی آواز کو بند کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

ضمیر کو مطمئن کرنا کون سا مشکل کام ہے کبھی معاشرے کی ، بھی حالات کی ، کبھی کبھی کسی فائدے کی تاویل دے کر نقصان اٹھانا کون سا مشکل کام ہے۔

وسط شب میں سلیپنگ پلز کھاتا ہوا انسان ، چھوٹی چھوٹی بات پر بڑھکتا ہوا انسان ، آخر کیا ہے جو آج کے انسان کو کسی صورت بھی چین نہیں لینے دیتا۔ یہ ضمیر ہی تو ہے.....تو پھر ہم وہ کیوں نہیں کرتے جس پر ہمارا ضمیر از خود مطمئن ہو!

نعت

(رفعت اشتیاق۔ گوجرہ)

لکھنے لگی تھی بیٹھ کے جب آرزوئے دل
کوئی بھی آرزو نہ تھی دل کی ترے سوا
سوچا کہ کیسے پا سکوں گی ان کے نقشِ پا
قرآں سے پھر ملا مجھے جو حوصلہ ملا
خوشبو تھی چار سو مرے فصلِ بہار کی
اک روشنی تھی جس نے مجھے راستہ دیا
دل کی یہ آرزو تھی کہ اس میں بسے کوئی
پھر کچھ نہ دل کو بھایا جب قرآن بس گیا

قصۂ شب

نگہت یاسمین

آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا یعنی عید کے فوراً بعد شادیوں کا سلسلہ۔ شب قدر کی ساعتوں میں دنیا و آخرت کی کامیابی کے ساتھ ساتھ کتنی ہی دعائیں مانگیں، کہ الٰہی اب ایسا ہو کہ احباب اور رشتے دار اپنی تقریب کے مہمانوں کی فہرست بنائیں تو ہمیں بھول جائیں اور ہم رات کے اندھیروں میں سوتے جاگتے انتظار کی گھڑیاں کاٹنے سے بچ جائیں۔

مگر جب شادیوں کے کارڈ آنا شروع ہوئے تو ہماری گھگھی بندھتی چلی گئی۔ آخر حد ہے ایک ہفتے میں تین بار گھڑی موڑ، گھڑیال توڑ اور وقت چھوڑ کر شادی میں شرکت کرنا یعنی انتہائی خشوع وخضوع سے جمائیاں لے کر حاضرین سے غائبین کے متعلق دریافت کرنا مگر تقریب کے بائیکاٹ پر ان کو دل ہی دل میں خراج تحسین پیش کرنا۔

مرتے کیا نہکرتے۔ بہت جانچ پڑتال کے بعد ایک دعوت نامہ منتخب کیا اور دوسروں کے لیے مناسب بہانے سوچ رکھے۔ خیر شادی تو شوہر صاحب کے دوست کی بہن کی تھی۔ کم جان پہچان کے باعث بہت زیادہ مسکرانے کا مصنوعی مظاہرہ بھی نہیں کرنا تھا۔ اور تھوڑا بہت خراٹے لینے کے مواقع بھی میسر آ سکتے تھے۔

سو بچوں کو سلا کر ساڑھے گیارہ بجے آنکھیں ملتے ہوئے گھر سے نکلے اور ناظم آباد سات نمبر پہنچے۔ ہال کے داخلی دروازے پر میزبان حضرات تو موجود تھے مگر خواتین کا پتہ نہ تھا۔ خیر پل صراط کے مانند باریک اور تنگ راستے سے گزرے۔ چلتے چلتے بٹوہ دبائے ایک خاتون کو دیکھا اور ہم پہلے ٹھٹکے اور پھر دبک گئے۔ جاہ وجلال چہرہ سے ٹپکا پڑتا تھا یا الٰہی میک اپ کا کمال یا عالم بالا سے انتہائی خوفناک حسینہ کی سواری، انسانوں کی ان کے اوقات و معاملات میں دخل اندازی پر غیض وغضب سے بھری اتری تھی۔ ہم نے جلدی سے ان کو منہ پھیر کر راستہ دیا اور درمیانی میزوں میں جگہ دیکھی وہیں بیٹھ گئے جہاں دو خواتین اور تین لڑکیاں پہلے سے براجمان تھیں۔ ان سے سلام دعا ہوئی۔ اتنے میں سرمئی مون لائٹ کی ساڑھی سنبھالتی آنچل لہراتی آبنوسی رنگت کی ایک خاتون ہمارے سامنے کرسی پر بیٹھی، اور پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ ایک ہاتھ میں موبائل دوسرے میں آئینہ کنگھا۔ صورت دیکھ کر دو چار بال ماتھے پر مزید پھیلا لیے۔

خالہ سلام۔ باجی سلام ہوا سو یہ باجی فرزانہ تھیں۔ گویا تقریب کی روح رواں۔ انھوں نے ہر ایک پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالی، پھر نمبر ملائے اور فون کان پر رکھا۔

''ہاں بھئی میں مصروف تھی تم نے کال کی تھی؟ ابھی تو کونسلر کی شادی میں بیٹھی ہوں۔ میری ماموں زاد ہے۔ کس کا؟ اچھا اچھا میں جاؤں گی۔'' فوراً ہی سیل فون ہٹا کر اعلان کیا۔ ''ارے بھئی رضیہ خالہ کا انتقال ہو گیا۔ تدفین آج ہی رات میں کر دی گئی۔'' جب رشتے دار خواتین نے خاطر خواہ اثر نہ لیا تو مرحومہ کی حیثیت اور اپنے ساتھ تعلقات کا حوالہ دیا۔ یوں محفل میں ایک دوسری مجلس کا انعقاد طے ہوا۔

فرزانہ باجی نے فوراً ہی پہلو بدلا اور ساتھ ہی موضوع بھی۔ ''ابھی دیکھ کر آ رہی ہوں بس انیقہ سٹیج پر آنے والی ہے۔ شہ زور کی زور آور نے تیار کیا ہے۔'' ان کی آنکھیں خود بخود میچ گئیں۔

پالر یا جم؟ ہم مارے حیرت کے کرسی سے گرتے گرتے بچے۔ کیا وقت آ لگا ہے۔ خواتین کی سجاوٹ کو نزاکت کی بجائے طاقت کے روپ میں ظاہر کیا جائے۔ یقیناً ٹی وی کے ٹاک شو کا موضوع.....دلہن پارلر سے تیار ہو یا جم سے؟

کیا کیا جائے کہ ہر گلی میں کھمبیوں کی طرح کھلتے پارلر ہیں یا فٹنس سینٹر Fitness Center معاشرے میں خواتین کے بدلتے ہوئے رجحان کے عکاس ہیں۔

ہم ابھی اپنی اجنبیت سے اور لطف اندوز ہوتے مگر فرزانہ باجی کی سوالیہ نگاہیں ہم پر پڑتی تھیں۔ زیادہ دیر تک یوں ہی بیٹھے رہنا شک کو جنم دیتا۔ لہٰذا اٹھے اور میزبان خاتون کو تلاش کرنے لگے۔ یہاں بھی فرزانہ باجی آگے

آئیں اور مسز عادل کو برآمد کیا۔

''ارے بھئی آپ تو کتنی ہی بار میز پر آئیں اور نظر سے گزریں۔'' ہم بے ساختہ بول اٹھے۔

ان کی خالی خالی نگاہوں میں ہمارے لیے شناسائی کی جھلک نہ تھی۔ ہم نے ان کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا۔

''بھابھی آپ ہماری نند کی شادی میں آئیں تھیں۔ ہم بلاوے پر آپ کی نند کی رخصتی میں شریک ہیں۔ ذرا ذہن پر زور ڈالیے۔'' کتنے مختصر مگر جان لیوا لمحات تھے بن بلائے مہمان کا انجام سوچ کر ہمیں جھرجھری آ گئی۔ جب دلہن نگاہ جھکانے کے بجائے زور دکھاتی ہو تو وہاں شرکاء کا کہنا کیا۔ خیر بعد از خرابی بسیار ہم پہچان لیے گئے۔

اتنے میں تین نوعمر بچیاں ساڑھی باندھے گزریں تو نگاہ ان پر ٹک گئی۔ الجھ الجھ جاتی تھیں مگر شوق کا کیا مول۔ یہ عادل کی بھتیجیاں ہیں۔ فرزانہ باجی نے ہمیں مشکوک جان کر نشانے کی زد پر رکھ لیا تھا مگر عادت سے مجبور ہو کر معلومات دیتی جاتی تھیں۔

چلیے دلہن سے ملتے ہیں۔ Stage پر جانے کی ہمت تو نہ تھی مگر ان کا اصرار۔ مجبوراً رسم پوری کی۔ واقعتاً شہ زور کی زور آور نے کمال کر دکھایا تھا۔ کہیں سے بھی نرمی و نازکی نہ چھلکے ہو۔ اک نگاہ ڈالی اور پھر دوسری کی تاب نہ تھی۔ ہم تو فوراً رخصت ہونا چاہتے تھے۔ مگر فرزانہ باجی کی نگاہ نہ چوکتی تھی۔ انہی لمحوں میزبان صاحب نے ہمارے بارے میں آگاہ کیا تو ان کا طرزِ تخاطب لہجہ سب کچھ ہی بدل گیا۔

''بھابھی میں آپ کے لیے کھانا لاتی ہوں۔'' وہ بچھی جاتی تھیں اور ہم شرمندہ۔ یا الٰہی ماجرا کیا ہے؟ انتہائی انتظار کے بعد کھانے کی اشتہا انگیز خوشبوؤں نے بھوک کے مارے مہمانوں کو داتا دربار کے لنگر کے منتظرین بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ کھانا ابھی شروع ہی ہوا تھا کہ ایک تیز سائرن کی آواز فضا میں گونجنے لگی۔ تہجد کا وقت معلوم ہوتا ہے تو کیا اب یہ ناری مخلوق واپسی کا سفر کرے گی؟ ہم نے دل میں سوچا۔

''کچھ نہیں یہ ہال والوں کی شرارت ہے۔'' انھوں نے جیسے دل کے خیالات پڑھ ڈالے۔

جلدی جلدی میزیں یوں صاف ہوئیں جیسے کبھی کچھ تھا ہی نہیں۔ اس حشر کے عالم میں میزبانوں کو تلاش کرنا بے سود۔ ہم بھی اٹھے اور باہر آ گئے۔

کہیں فرزانہ باجی ہمارے کندھوں پر سوار ہو کر گھر تک نہ آ جائیں۔

☆☆☆